بُرقعے

سعادت حسن منٹو

برقعے

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور

برقعے

سعادت حسن منٹو

جملہ حقوق بحق بیگم صفیہ منٹو محفوظ ہیں

ناشر .... نواز
مطبع .... معظم پرنٹرز لاہور
قیمت .... -/۱۵ روپے

انتساب

اُن عورتوں کے نام جنہیں
برقعوں
سے نفرت ہے!

منٹو

فہرست

	صفحہ
پسینہ	9
گھوگا	19
تیقن	32
خط اور اس کا جواب	42
موج دین	52
ایک بھائی ایک واعظ	62
چودھویں کا چاند	73
باردہ شمالی	84
قرض کی پیتے تھے	91
پُراسرار نینا	98
بُرقعے	150

پسینہ

"میرے اللہ آپ تو پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔"

"نہیں ــــ کوئی اتنا زیادہ تو پسینہ نہیں آیا ــــ"

"ٹھہریئے میں تولیہ لے کر آؤں ــــ"

"تولیے تو سارے دھوبی کے ہاں گئے ہوئے ہیں ــــ"

"تو میں اپنے دوپٹے سے ہی آپ کا پسینہ پونچھ دیتی ہوں"

"تمہارا دوپٹہ ریشمین ہے پسینہ جذب نہیں کر سکے گا۔" (1)

"پسینے کے یہ قطرے مجھ سے نہیں دیکھے جاتے ــــ آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ریشمی کپڑا پانی جذب نہیں کر سکتا ــــ لیکن میں آپ کا تولیہ ہوں۔ کیا میں آپ کا پسینہ خشک نہیں کر سکتی۔"

"آج گرمی زیادہ تھی ــــ سائیکل پر یہاں آتے آتے میں قریب قریب بیہوش ہو گیا تھا۔"

"ہائے اللہ ــــ"

"نہیں ۔۔۔ بس میں چند منٹوں میں ٹھیک ہو گیا ۔۔۔ ایک دوست تھا اس نے مجھے آموں کا شربت پلا دیا ۔۔۔"

"آموں کا شربت بھی ہوتا ہے"

"ہر شے کا شربت بنایا جا سکتا ہے ۔"

"میرا بھی ۔۔"

"تمہارا شربت تو میں ہر روز پیتا ہوں ۔۔۔ لیکن اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا ۔۔۔"

"شریر کہیں کے ۔"

"شرارت تو تمہاری ہوتی ہے کہ تم مٹھاس میں کھٹائی ڈال دیتی ہو ۔۔۔"

"کھٹائی تو آپ ڈالتے ہیں ۔۔۔ میں تو مصری کی ڈلی ہوں ۔۔"

"مانتا ہوں ۔۔ لیکن کبھی کبھی ۔۔۔"

"آپ مجھ سے ذرہ زیادہ نہ کہیے ۔۔۔ ادھر آیئے ۔۔۔ میں آپ کی ٹائی اتار دوں ۔۔"

"آج اتنا تکلف کیوں کیا جا رہا ہے ؟"

"آپ محبت کو تکلف کہتے ہیں ۔"

"اس کے متعلق میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ۔۔۔ ویسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اتنی محبت کا اظہار تم نے پہلے کبھی نہیں کیا ۔"

"آپ محبت کو کیا جانیں ۔۔"

"انسان اگر محبت ہی کو جان پہچان نہیں سکتا تو میں سمجھتا ہوں ۔ وہ حیوان بھی نہیں ۔۔۔ کوئی بے حس چیز ہے ۔۔۔ پتھر ۔۔۔ سڑک پر گرا ہوا روڑا ہے ۔"

"ادھر آیئے میں آپ کی ٹائی اتار دوں ۔۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ تکلف کی بات کیوں کرتے ہیں ۔ میں نے کبھی آپ سے تکلف برتا ہے"

"آج پہلی مرتبہ ۔۔"

"آپ اتنے ذہین ہیں ۔۔۔ بتایئے اس تکلف کی وجہ کیا ہے"

"میں اتنا ذہین نہیں ہوں ۔"

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں ۔"

"جناب میں کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا ۔۔۔ ایک حقیقت تھی جو میں نے بیان کر دی ۔۔۔"

"میرے پاس تو آیئے ۔۔۔ میں آپ کا پسینہ پونچھ دوں ۔۔ گرمی میں بے حال ہو کر آ رہے ہیں ۔۔"

"کوئی اتنی زیادہ بے حالی نہیں ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج درجہ حرارت بہت بڑھا ہوا ہے سننے میں آیا ہے کہ آج دو آدمی اس حدت کے باعث مر گئے ہیں ۔"

"میں کہتی ہوں ۔۔ آپ اتنے روپے خرچ کرتے ہیں کیوں نہیں گھر میں

لیا۔ کولر لے آتے۔"

"کولر کی کیا ضرورت ہے تم خود بہت بڑی کولر ہو۔ اتنی گرمی میں گھر آیا ہوں تمہاری باتوں ہی نے ایسی ٹھنڈک پہنچا دی ہے جو سب سے بڑا کولر بھی نہیں پہنچا سکتا"

"آپ نے اب میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔"

"تمہاری قسم — میں ایسی گستاخی کبھی نہیں کرتا۔"

"میری قسم آپ نے کیوں کھائی ہے"

"اس لئے کہ بڑی لذیذ ہے۔"

"یعنی آدمی کو وہی قسمیں کھانی چاہئیں جو مزیدار ہوں۔"

"یقیناً —"

"آپ سے میں کبھی جیت نہیں سکتی۔"

"میں تو ہمیشہ ہارتا رہا ہوں۔"

"آپ کب ہارے ہیں — ہار تو ہمیشہ میری ہی ہوتی رہی ہے۔"

"اچھا — اب ذرا میں آرام کرنا چاہتا ہوں — میری شلوار قمیض تو نکال دو —"

"الماری میں صرف ایک پاجامہ موجود ہے"

"بنیان ہوگی —"

"جی نہیں — تین میلی پڑی ہیں جو نوکر نے ابھی نہیں دھوئیں"

"ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں تو تمہیں خود دھو لینی چاہئیں۔"

"آپ کو کیا معلوم کہ صابن کتنا واہیات ہوتا ہے — چھالے پڑ جاتے ہیں ہاتھوں میں —"

"نوکروں کے ہاتھوں میں بھی یقیناً چھالے پڑتے ہوں گے۔"

"آپ ہمیشہ نوکروں کی طرف داری کرتے ہیں —"

"کیا وہ انسان نہیں —"

"خیر چھوڑیئے اس قصے کو — ادھر آیئے — میں آپ کی ٹائی اتار دوں —"

"یہ کونسی اتنی بڑی مہم ہے جو آپ سر کرنا چاہتی ہیں —"

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی — یہ بتایئے کہ آپ کو چلنے میں تکلیف کیوں محسوس ہو رہی ہے"

"جوتا ذرا تنگ ہے"

"یہ وہی ہے نا جو آپ نے پچھلے مہینے لیا تھا۔"

"ہاں — وہی ہے — آج پہلی مرتبہ پہنا ہے"

"دیکھ کے نہیں لیا تھا —"

"دیکھ کر ہی لیا تھا — پہنا بھی تھا — پر —"

"چھوٹا کیسے ہو گیا —"

"جو چیز استعمال نہ کی جائے سکڑ جاتی ہے"

"یہ عجیب منطق ہے"

"عورتوں کو اپنے خاوندوں کی ہر بات عجیب منطق معلوم ہوتی ہے۔"

"میں نے کہا ادھر آئیے آپ کی ٹائی اتار دوں۔"

"پہلے تو میں یہ تکلیف دہ جوتے اتارنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹھ جائیے — میں اتار دیتی ہوں۔"

"آج تم اتنی مہربان کیوں ہو — ؟ پہلے تو......"

"آپ نخرے نہ بگھاریئے — بیٹھئے کرسی پر۔"

"یہاں سب کرسیاں اس قابل کہاں ہیں کہ ان پر آدمی بیٹھے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ان کا بید بالکل ناکارہ ہو جائے گا تو میں سب کی سب ٹھیک کروا دوں گی۔"

"یہ تمہاری عجیب منطق تھی جس کے متعلق میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ مبادا تم ناراض ہو جاؤ۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میں چاہتی تھی کہ جب تک یہ کرسیاں کام دیتی ہیں ان کی مرمت نہ کرائی جائے — کیونکہ انہیں مقررہ وقت پر پھر مرمت طلب ہونا ہے۔ جتنے دن نکل جائیں ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال ہے تم بھی مرمت طلب ہو۔"

"دیکھئے — میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی — آپ بڑے بے لگام ہوتے جا رہے ہیں۔"

"چلئے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔"

"آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے۔"

"تم ہی نے تو مجھ سے کہا ہے کہ آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ آپ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے بیٹھ رہیں۔"

"تم مجھے کچھ کھانے کے لیے دو۔"

"میں کیا دوں — آپ باہر سے کھا کر آ رہے ہیں۔"

"تم نے کیسے جانا۔"

"آپ کا یہ پتلون بتا رہا ہے — سالن کے داغ لگے ہیں۔ ضرور آپ نے کسی ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ عیاشی کی ہو گی۔"

"عیاشی تو خیر نہیں کی۔ لیکن مجبوراً اپنے افسر کے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہونا پڑا — اور تم جانتی ہو — اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے صرف چند لقمے منہ میں ڈالے اور ہاتھ اٹھا لیا — اس لیے کہ کھانا بڑا واہیات تھا اس میں تمہارے ہاتھوں کا نمک نہیں تھا۔"

"لیکن یہ پتلون پر دھبے کیسے پڑے۔"

"اس لیے کہ سالن واہیات تھا — مجھ سے دو مرتبہ چاول نیچے گر گئے"

"چاول تو آپ سے ہمیشہ نیچے گرتے رہتے ہیں۔"

"اس کو چھوڑو — مجھے یہ بتاؤ کہ فرش پر شربت کس نے گرایا تھا اور وہ — یہ گلاس — جگ — کوئی مہمان آیا تھا۔"

"ہاں — میری ایک سہیلی آئی تھی۔"

"کون۔"

"آپ اسے نہیں جانتے — کوئٹے کی تھی جو میرے ساتھ پڑھتی تھی اس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔"

"اس سے کیا باتیں ہوئیں —"

"میں آپ کو کیوں بتاؤں — ویسے وہ اپنے خاوند سے بہت خوش تھی۔"

"ہر عورت کو اپنے خاوند سے خوش ہونا چاہیئے — اس میں اس کی کیا برتری ہے۔"

"نہیں — وہ —"

"کیا۔"

"وہ بے حد خوش تھی — اس نے مجھے —"

"کیا —"

"ایسی ایسی باتیں سنائیں جو — جو مجھے معلوم ہی نہیں تھیں۔ شاید آپ کو بھی معلوم نہ ہوں۔"

"اس گفتگو کو چھوڑیئے — آیئے میں آپ کے جوتے اتار دوں۔"

"یہ کام میں بھی خود بھی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں میں آج خود کروں گی — پہلے ٹائی اتارنے دیجئے۔

اتار دیجئے۔"

"آپ آج کتنے اچھے لگتے ہیں —"

"اس کی وجہ کیا ہے — پہلے تو میں تمہیں کبھی اچھا نہیں لگا تھا آج یک بیک انقلاب کیسے پیدا ہو گیا —"

"انقلاب کیسا — میں شروع ہی سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میرا سارا دوپٹہ گیلا ہو گیا ہے — توبہ آپکو اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے"

"چلئے اندر —"

"چلو —"

"یہاں باہر کی بہ نسبت گرمی کس قدر کم ہے"

"ہاں۔"

"اس شوز نے تو آپ کی انگلیوں پر خیٹیاں ڈال دی ہیں"

"ہر تنگ چیز راحت کا باعث ہوتی ہے"

"میں بھی آج سے تنگ ہو گئی ہوں"

"مجھ سے۔"

"نہیں — میری سہیلی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا خاوند — خیر آپ اس قصہ کو چھوڑیئے — اس نے بڑی تنگ اور چست چولی پہنی ہوئی تھی۔"

"میں نے اب دیکھا ہے کہ تم بھی اسی قسم کا بلاؤز پہنے ہو — کہاں سے لیا تم نے —"

"آج ہی اس کے درزی سے سلوایا ہے"

"اور میں جو ساڑھی لایا ہوں ——"

"وہ اس سے میچ نہیں کرتی —— خیر میں آپ کے ساتھ چلوں گی اور اس دوکان میں کوئی اور ساڑھی پسند کر لوں گی ——"

"اس سہیلی نے تم سے کیا باتیں کیں ——"

"آپ لیٹ جایئے —— پھر آپ کو پسینہ آ رہا ہے —— میں آپ کو اس کی تمام باتیں سنا دوں گی ——"

"تم اپنی سہیلی سے ایسی باتیں ہر روز سنا کرو —— تاکہ ہماری زندگی خوشگوار رہے اور تم میرے پسینے کو اپنے دوپٹے سے اسی طرح پونچھتی رہو۔"

"آپ کا پسینہ تو اب میرا لہو بن گیا ہے۔"

گھوگا

میں جب ہسپتال میں داخل ہوا تو چھٹے روز میری حالت بہت غیر ہو گئی کئی روز تک بیہوش رہا —— ڈاکٹر جواب دے چکے تھے لیکن خدا نے اپنا کرم کیا اور میری طبیعت سنبھلنے لگی۔

اس دوران کی مجھے اکثر باتیں یاد نہیں دن میں کئی آدمی ملنے کے لئے آتے لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں کون آتا ہے —— کون جاتا تھا۔ میرے بستر مرگ پر جیسا کہ مجھے اب معلوم ہوا دوستوں اور عزیزوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ بعض روتے، بعض آہیں بھرتے۔ میری زندگی کے بیتے ہوئے واقعات دہراتے اور افسوس کا اظہار کرتے ——

جب میری طبیعت کسی قدر سنبھلی اور مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے آہستہ آہستہ اپنے گردو پیش کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ میں جنرل وارڈ میں تھا دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کا پہلا بیڈ میرا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی الماری تھی جس میں خاص خاص دوائیں اور آلاتِ جراحی تھے دیگر سامان

بھی تھا۔ مثلاً گرم پانی اور برف کی ربڑ کی تھیلیاں، تھرمامیٹر بستر کی چادریں کمبل اور روئی وغیرہ اس کے علاوہ اور بے شمار چیزیں تھیں جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

کئی نرسیں تھیں ـــــ صبح سات بجے سے دو بجے دوپہر تک دو بجے سے شام کے سات بجے تک چار چار نرسوں کی ٹولی اس وارڈ میں کام کرتی رات کو صرف ایک نرس ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔

رات کو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ یوں تو اکثر آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا لیکن کبھی کبھی نیم مندی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتا کہ کیا ہو رہا ہے ان دنوں جو نرس رات کی ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ وہ اس قدر مختصر تھی کہ اسے کوئی بھی اپنے بٹوے میں ڈال سکتا تھا۔ گہرا سانولا رنگ ہر عضو ایک خلاصہ ـــــ ہر خدوخال ہمیشہ کی فوری تمت ـــــ انتہا درجے کی غیر نسوانی لڑکی تھی ـــــ معلوم نہیں قدرت نے اس کے ساتھ اس قسم کا غیر شاعرانہ سلوک کیوں کیا تھا۔ کہ وہ شعر تھی نہ رباعی ـــــ نہ قطعہ البتہ استاد امام الدین کی تک بندی معلوم ہوتی تھی۔

ہر نرس کا کوئی نہ کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ مگر اس غریب کا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نرسنگ کے پیشے کو باوجود اس کی موجودہ گراوٹوں کے احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں اس لئے مجھے اس نرس سے جس کا نام مس جیکب تھا۔ بڑی ہمدردی تھی۔ اس سے کوئی مریض دلچسپی نہیں لیتا تھا۔

ایک شام کو جب وہ آئی اور میرے بستر کے پاس سے گزری تو میں نے اپنی نحیف آواز میں اس سے کہا۔

"اسلام علیکم مس جیکب ـــــ" اس نے میری آواز سن لی فوراً رک کر اس نے جواب دیا۔ سلاما الیکم ـــــ"

بس اس کے بعد میرا یہ دستور ہو گیا کہ جب وہ شام کو ڈیوٹی پہ آتی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کو میری اسلام علیکم سنائی دیتی مجھے نیند آنا شروع ہو گئی تھی لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے جاگ جاتا مس جیکب رات بھر کی جاگی ہوئی مریضوں کے ٹمپریچر لینے میں مصروف ہوتی جب میرے بستر کے پاس آتی تو میں پھر اسے سلام کرتا۔

اسلام علیکم کا یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ہو گیا ـــــ وہ اس لحاظ سے چڑ گئی کہ پہل میں کیوں کرتا ہوں چنانچہ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ مجھ سے سبقت لے جائے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ لیکن ایک روز صبح سویرے جبکہ زیادہ دیر تک جاگنے کے باعث میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب وہ میرا ٹمپریچر لینے کے لئے آئی تو اس نے اپنی مہین سیٹی جیسی آواز کو زوردار بنا کر کہا۔

سلاما لیکم ـــــ"

میں چونک پڑا ـــــ آنکھیں کھولیں ـــــ تو دیکھا کہ مس جیکب کا مختصر وجود میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے بڑی فراخدلی سے اپنی شکست تسلیم کی اور اس کے مطابق مناسب و موزوں مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا

کی گولیاں نکال رہا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی چور چوری کر رہا ہے میں نے کوئی مداخلت نہ کی۔

میں نے دوسرے دن نرس نغیمہ حق سے جو ہر صبح میرا بدن چھوٹے چھوٹے تولیوں سے کنکنے پانی میں صابن کے ساتھ صاف کیا کرتی تھی اور پرلے درجے کی شریر تھی۔ پوچھا کہ انیس نمبر کے بیڈ کا مریض کون ہے ؟

اس کا سانولا چہرہ سوال بن گیا ——— "آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ ؟"

میں نے اس سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں افسانہ نگار ہوں مجھے ہر شخص سے دلچسپی ہے خواہ وہ مریض ہی کیوں نہ ہو۔"

"اس میں کیا بات ہے ؟"

"جو تم میں ہے ——— تم شریر ہو ——— وہ چور ہے"

نغیمہ حق کو میری یہ بات ناگوار معلوم ہوئی ——— "شرارت اور چوری کو آپ ایک ہی بات سمجھتے ہیں"

وہ میرے بالوں بھرے سینے پر تولیہ پھیر رہی تھی میں نے اپنے کمزور ہاتھ سے اس کے گال پر ہولے سے چپت لگائی۔ اور کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا ——— تم میرے سوال کا جواب دو کہ انیس نمبر کے بیڈ کا جو مریض ہے۔ اس کا کیا نام ہے۔ ؟"

نغیمہ نے جواب دیا۔ "گھوگا۔"

کر کے جواب دیا "وعلیکم السلام مس جیلیب آج تو آپ نے کمال کر دیا۔"

وہ بیحد خوش ہوئی ——— چنانچہ اس خوشی میں اس نے میرا دو مرتبہ ٹمپریچر لیا کہ پہلی دفعہ اس نے تھرما میٹر اچھی طرح جھٹکا نہیں تھا۔

ایک رات جبکہ مجھے بالکل نیند نہیں آرہی تھی اور میں بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا کہ دن ہونے میں کتنی دیر ہے بارہ بجے کے قریب میں نے اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا کہ میز کے وسط میں جو میز پڑا ہے اس کے ساتھ کرسی پر مس جیلیب اپنے تمام اختصار کے ساتھ بیٹھی ہے اور ایک مریض جو موٹا تھا اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

چونکہ خاموشی تھی۔ اسی لئے میں اس کی گفتگو سن سکتا تھا۔ وہ نرس سے بڑے بیتیمانہ قسم کے عشق کا اظہار کرنے کی سعی کر رہا تھا پہلے وہ کچھ دیر چپڑاسیوں کی مانند جن کا صاحب اپنی مسند پر موجود تھا کھڑا رہا پھر وہ اس سے مخاطب ہوا ——— "مس صاحبہ ——— کیا اس وقت آپ مجھے اسپرین کی گولی دے سکتی ہیں۔"

مس جیلیب غالباً رپورٹ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس موٹے مریض کی طرف دیکھا ——— قلم میز پر رکھ کر اٹھی اور اس الماری میں سے جو میرے بستر کے قریب تھی۔ اسپرین کی ایک گولی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

رات کے دو بج گئے۔ میں جاگ رہا تھا ——— لیکن میری آنکھیں نیند بھری جب آہٹ ہوئی تو میں نے کروٹ بدل کر دیکھا کہ وہی موٹا مریض الماری کھول کر اسپرین

"یہ کیا نام ہے؟"

"بس ہے۔ ہم نے رکھ دیا ہے!"

میں اس سے کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ نعیمہ نے ابالی ہوئی سرنج پکڑا دی اور اس میں ایک سی سی وٹامن بی کمپلکس ڈال کر سوئی میرے سوکھے ہوئے بازو میں کھبو دی۔ مجھے سخت درد ہوا اسی لئے میں گھوگا کو بھول گیا۔ "گر آتے" میں عذرا آ گئی۔۔۔ یہ نرس نعیمہ سے چار سال آگے تھی۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوتی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ انیس نمبر کے بیڈ کا مریض ان دونوں نے مل کر تجویز کیا ہے۔

عذرا نے پہلے میری خیریت پوچھی ۔۔۔ پھر کہا۔ "خیریت تو ہے آپ گھوگے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔"

میں نے درد کے باعث ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ "گھوگا جائے جہنم میں۔ اور تم بھی اس کے ساتھ۔۔۔"

عذرا مسکرائی۔۔۔ "میں تو اس کے ساتھ جہنم کی آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہوں۔۔۔"

نعیمہ نے پوچھا۔ "کیوں؟"

عذرا نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے عزت کرتا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

نعیمہ نے عذرا کے چٹکی لی اور بڑے زور سے کہا۔ "وہ تو مجھ سے محبت کرتا

ہے۔ چلو آؤ اب ۔۔۔ ابھی فیصلہ کر لیں۔ گھوگا سے پوچھ لو ۔۔۔ ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے دو مکان میرے نام لکھ دے گا۔"

عذرا نے ٹکھی مار چھیڑی نعیمہ نے سر پر ماری ۔۔۔ "وہ دو مکان کیا دو اینٹیں بھی تمہارے نام نہیں لکھے گا۔ وہ گھوگا ہے ۔۔۔ بہت بڑا گھوگا ۔۔۔ تم اس کو ابھی تک نہیں پہچانی ہو۔"

اس کے بعد مجھے چند روز میں اس موٹے مریض کے متعلق عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں جس کو نعیمہ اور عذرا نے گھوگے کا نام دے رکھا تھا۔

اس کا نام غلام محمد تھا۔ ماسٹر غلام محمد بی اے بی ٹی کسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر ۔۔۔ اس کو دمے کا مرض تھا بڑی شدید قسم کا دمہ تھا جب اسے دورہ پڑتا تو سارا وارڈ اس کے دھونکنی ایسے چلتے ہوئے سانسوں کے زیر و بم سے گھنٹوں گونجتا رہتا لیکن اس حالت میں بھی وہ نظر بازی سے نہ ٹلتا۔

اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی ۔۔۔ مگر کنوارہ تھا ۔۔۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی اس لئے نہیں کی کہ وہ دمے کا مریض ہے۔ کسی لڑکی کی زندگی کیوں خراب کرے۔

اس کی دو بہنیں تھیں جو عمر میں اس سے کچھ چھوٹی تھیں یہ بھی کنواری تھیں ان کے متعلق مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ بڑی ہیلتھ وزیٹر ہے اور چھوٹی استانی۔ یہ دونوں بلا ناغہ آتیں اور گھوگے کے پاس اپنے برقعوں سمیت ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس چلی جاتیں وہ اس کے ناشتے اور دو وقت کے

کھانے کے لئے پراٹھے اور سالن وغیرہ لایا کرتی تھیں۔

اس کو ایسے ٹیکے لگ رہے تھے۔ جن سے اشتہا بڑھ جاتی ہے لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مریض زیادہ نہ کھائے تاکہ اس کا وزن نہ بڑھے مگر گھوگا بلا خور تھا گھر سے جو کچھ آتا چٹ کر جاتا پھر اس کے ساتھ والے بیڈ پر بنگالی نوجوان تھا جو عرصے سے ٹائیفائیڈ میں گرفتار تھا اس کو بھوک نہیں لگتی تھی گھوگا اس کا کھانا بھی اپنے پیٹ میں ڈال لیتا۔ مگر نغمہ نے مجھے بتایا کہ ہسپتال سے جو اسے مفت کھانا ملتا ہے اس کے علاوہ وہ ادھر اُدھر سے اور اکھٹا کرتا ہے اور اپنی بہنوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

ایک رات جبکہ مجھے نیند آنے ہی والی تھی میں نے دیکھا کہ گھوگا دبے پاؤں چلا آرہا ہے ۔۔۔۔ رات کی نرس کسی دوسرے وارڈ کی نرس سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ گھوگے نے الماری کھولی اور اس میں کئی چیزیں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں ۔۔۔۔ مجھے اس کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی لیکن اسے میں کچھ نہ کہہ سکا اس لئے کہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر روز الماری میں سے چیزیں چُراتا اور میں اسے ٹوک نہ سکتا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ جب اسے دوائیں برابر ملتی ہیں تو وہ اور دوائیاں جو اس کے مرض دمے کا علاج نہیں تھیں کیوں اس طریقے سے حاصل کرتا ہے۔

نغمہ حق سے میں نے پوچھا تو اس نے مخصوص انداز میں گردن کو ایک خفیف سی جنبش دے کر اور اپنے سانولے ہونٹوں پر ان سے زیادہ گہرے رنگ کی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔

"جناب اتنے بڑے رائیٹر بنے پھرتے ہیں آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قیمتی دوائیاں اور انجکشن چراتا ہے۔ اپنی بہن کو جو کہ ہلیتھ وزیٹر ہے دے دیتا ہے۔ اس کو روزانہ بیڈ کے لئے ایک روپیہ دینا پڑتا ہے ۔۔۔۔ بہت بڑا گھوگا ہے۔ اس لئے وہ اس خرچ کی کسر پوری کر لیتا ہے بلکہ اس کو کچھ پرافٹ ہی ہوتا ہے۔"

نغمہ کا یہ کہنا درست ہے اس لئے کہ میری بیوی کے بیان سے اس کی تصدیق ہو گئی اس کو گھوگے سے سخت نفرت تھی۔ ہسپتال سے جو کچھ ملتا تو وہ اپنی بہن کے سپرد کر دیتا ۔۔۔۔ کھانا بھی ۔۔۔۔ ایک اور نرس رفیقہ تھی وہ اس مریض کا نام بھی لینا نہیں چاہتی تھی۔

شکل وصورت کی معمولی مگر نوجوان تھی ہر وقت اپنے سفید فراک کو پیٹی کے نیچے کھینچتی اور پھر اپنے سینے کے ابھاروں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی مگر کردار کے لحاظ سے وہ دوسری نرسوں کے مقابلے میں بہت مضبوط تھی۔ اس کو گھوگے سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ اس سے بے معنی باتیں کرتا تھا۔

دراصل وہ ہر نرس سے بے معنی یا با معنی باتیں کرنے کا عادی تھا میں

میں نے کئی بار دیکھا کہ پہلے اس نے کسی نرس سے رسمی بات چیت کی اس کے بعد بستر پر سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ اس بھونڈے طور پر کہ وہ غریب اکتا گئی اور اس نے جو دوا مانگی الماری میں سے نکال کر اس کو دے دی کہ جھگڑا کا رائے۔

قریب قریب ہر نرس اس سے متنفر تھی ۔۔۔ مجھے خود وہ بہت ناپسند تھا ۔۔۔ میرے بستر کی طرف رخ کرتا تو میں چادر اوڑھ لیتا تاکہ اس کو یہ معلوم ہو کہ میں سو رہا ہوں۔ اس کا بات چیت کا انداز مجھے کھلتا تھا یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے کبھی برداشت نہ کیا۔

مجھ سے دو تین مرتبہ اس نے چند روپے بطور قرض لئے اور واپس نہ دیئے مجھے اس کا کوئی خیال نہ تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پندرہ روپے اس نے مجھ سے اس لئے حاصل کئے تھے۔ کہ اس کو دس روپے ایک خاص دوا کے لئے خرچ کرنا پڑے تھے۔ جو ہسپتال میں نہیں تھی۔ تو میری طبیعت بہت مکدر ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں اس کو سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر تمام ڈاکٹروں پر اس کے ذلیل کردار کی وضاحت کر دی۔

وہ پہلے میری بتائی ہوئی باتیں نہ مانے انہوں نے کبھی ایسا مریض دیکھا تھا نہ سنا ۔۔۔ مگر نرسوں سے پوچھ گچھ کے بعد ان کو حقیقت معلوم ہو گئی اور انہوں نے گھوگے کو رخصت کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس کا علم تھا چنانچہ میں نے محض اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی خاطر اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"سنا ہے آپ کل پرسوں جانے والے ہیں۔"

گھوگے نے اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور تعجب کا اظہار کیا۔

"بڑے ڈاکٹر صاحب نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اور چھٹی لو ۔۔۔ اور میں ایک مہینے کی لے چکا ہوں ۔۔۔"

میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ ایک مہینہ اور ۔۔۔ تیس دن مزید چوریوں کے ۔۔۔ نرسوں کے پیچھے چلنے اور ہاتھ مل مل کے دوائیں مانگنے کے۔

بڑے ڈاکٹر صاحب بہت نرم دل تھے۔ میں نے سوچا یقیناً گھوگے نے اپنے مخصوص لسوڑے کی لیس ایسے انداز میں ان کی منت سماجت کی ہو گی" اور انہوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے اس کو ایک ماہ اور ہسپتال میں رہنے کی اجازت دے دی ہو گی۔ مگر اسی دن گھوگا انتہائی افسردگی کے عالم میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں کل جا رہا ہوں ۔۔۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔۔۔ مگر ماسٹر صاحب آپ نے تو ایک مہینے کی چھٹی لی ہے۔ ابھی ابھی۔"

اس نے آہ بھر کر جواب دیا "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ تمہارا کافی علاج ہو چکا ہے۔ اب تم گھر میں آرام کرو ۔۔۔"

"میں نے کہا۔ یہ بہتر ہے۔"

لیکن گھوگے کا چہرہ تنا رہا تھا۔ کہ گھر میں اسے چرانے کے لئے دوائیں

نہیں ملیں گی۔ نرسیں بھی نہ ہوں گی ــــ جھک مارے گا وہاں ــ

میں صبح چار ساڑھے چار بجے کے قریب سویا۔ دس بجے آنکھ کھلی۔ نعیمہ حتی میرے پاس کھڑی تھی دراصل اسی نے مجھے جگایا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے کوئی خبر سنانا چاہتی ہے مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔

مکھی مار چھڑی سے میری بستر پر چند غیر مرئی مکھیاں مارنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"لکھو گا گیا۔

میں نے کہا۔

"ہاں سنا تھا۔ کہ وہ جا رہا ہے۔"

نعیمہ کے سانولے ہونٹوں پر سکڑی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی ــــ اور وہ بھی گئی۔

"میں نے پوچھا ــــ "کون۔"

نعیمہ نے جواب دیا ــــ "وہ ــــ وہ مس جیکب ــــ جس کے متعلق آپ کہا کرتے تھے ــــ کہ اتنی مختصر ہے کہ بٹوے میں سما سکتی ہے۔ لیکن گھوگے کے پاس تو کوئی بٹوہ نہیں تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ مس جیکب کو گھوگے میں کیا نظر آیا یا گھوگے کو مس جیکب میں کیا خوبی دکھائی دی ــــ لیکن میرے روزنہ مس جیکب نائٹ ڈیوٹی

پر تھی۔ جب وہ صبح میرے بستر کے قریب آئی تو میں نے زور سے السلام علیکم کہا اس نے چونک کر دھیمی آواز میں اس سلام کا جواب دیا اور میرا ٹمپریچر لیے بغیر چلی گئی

سات بجے جب دوسری نرسیں آگئیں تو نعیمہ نے میرا بدن پونچھنے کے لیے گرم پانی تیار کرتے ہوئے اپنے سانولے ہونٹوں پر کنکنی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ــــ "گھوگے کے پاس بٹوہ نہیں تھا اس لیے آپ کی مس جیکب واپس تشریف لے آئی ہیں۔"

میں نے پوچھا ــــ "کیا ہوا۔"

نعیمہ نے گرم گرم پانی میں تر کیا ہوا تولیہ میرے بازو پر رکھ دیا۔

"کچھ خاص تو نہیں ہوا ــــ صرف مس جیکب کے کانوں کی دو سونے کی بالیاں گم ہو گئی ہیں ــــ شاید گھوگے کی بہن کے کان ننگے ہوں گے۔"

٭

تیقّن

ادھر سے مسلمان اور ادھر سے ہندو ابھی تک آجا رہے تھے کیمپوں کے کیمپ بھرے پڑے تھے۔ جن میں تِل دھرنے کے لئے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ غلہ ناکافی ہے اور حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں ——— بیماریاں پھیل رہی ہیں اس کا ہوش کس کو تھا ——— ایک افراط اور تفریط کا عالم تھا۔

۴۸ء کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ ——— اِدھر اور اُدھر دونوں طرف رضاکاروں کے ذریعہ سے مغویہ عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مرد عورتیں لڑکے اور لڑکیاں اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں نے جب ان کو سرگرمِ عمل دیکھا تو مجھے بڑی تعجب خیز مسرت حاصل ہوتی ——— یعنی خود انسان انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جو عصمتیں لٹ چکی تھیں ان کو

مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا۔ کس لئے۔ اس لئے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلودہ نہ ہو ——— اس لئے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر روٹی کھائے اس لئے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگہ لے کر جب تک دوسرے آنکھیں بند کئے ہیں عصمتوں کے چاک رفو کر دے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا ——— لیکن ان رضاکاروں کی جد و جہد پھر بھی قابلِ قدر معلوم ہوتی تھی۔

ان کو سینکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ہزاروں کھکیڑے تھے جو انہیں اٹھانے پڑتے تھے کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں۔ سیماب پا تھے آج اِدھر، کل اُدھر ابھی اس محلے میں ابھی اس محلے میں اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔

عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں ——— ایک لیاژاں افسر نے مجھے بتایا کہ سہارنپور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے۔ اور کسی دور دراز سفر پر جا رہی ہے ——— کئی لڑکیوں نے راستے میں والدین کے خوف سے خودکشی کر لی بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پاگل ہو چکی تھیں کچھ ایسی بھی تھیں جن کو شراب کی لت پڑ چکی تھی وہ ان کو پیاس لگتی تو پانی کی بجائے شراب

مانگتیں۔ اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں ——!

میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھرتے —— ان پیٹوں کا کیا ہوگا؟ ان میں جو کچھ بھرا ہے۔ اس کا مالک کون ہے۔ پاکستان یا ہندوستان؟

اور وہ نو مہینوں کی بار برداری —— اس کی اجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان —— ؟ کیا یہ سب ظالم فطرت کا بہی کھاتے میں درج ہوگا۔ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے؟

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں —— برآمدہ عورتیں جارہی تھیں۔

میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مغویہ کیوں کہلاتی جاتی ہیں —— انہیں اغوا کب کیا گیا ہے —— اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں —— لیکن یہ اغوا کیسا ہے۔ کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھڑی میں قید کر لیا۔

لیکن وہ زمانہ ایسا تھا۔ کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بیکار چیزیں تھیں —— ان دنوں جس طرح گرمیوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے اس طرح میں نے بھی اپنے دل و دماغ کے بھی سب کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے تھے حالانکہ انہیں کھلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی —— لیکن میں کیا کرتا —— مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔

برآمدہ عورتیں آرہی تھیں —— برآمدہ جارہی تھیں۔

یہ درآمد اور برآمد جاری رہی —— تمام تاجرانہ خصوصیات کے ساتھ۔!

اور صحافی افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آرہا تھا قلموں کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے تھے اتنے سید تھے کہ سب بوکھلا گئے تھے۔

ایک لیاژاں افسر مجھ سے ملا کہنے لگا —— تم کیوں گم سم رہتے ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے مجھے ایک داستان سنائی۔

مغویہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں ایک شہر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں —— پھر تیسرے گاؤں —— پھر چوتھے گلی گلی محلے محلے —— کوچے کوچے —— بڑی مشکلوں سے گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔

میں نے دل میں کہا۔ "کیسے گوہر —— کیسے ناسفتہ —— یا سفتہ ——؟

تمہیں معلوم نہیں —— ہمیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتلانے والا تھا۔ ہم باڈر کے اس پار سینکڑوں پھیرے کر چکے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھا —— ادھیڑ عمر کی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے جالندھر کی بستیوں میں دیکھا۔ پریشان حال ماؤف دماغ۔ ویران ویران آنکھیں گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال پھٹے ہوئے

کپڑے۔ اسے تن کا ہوش تھا۔ نہ من کا۔ لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

مجھے — بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمہ کے باعث پاگل ہو گئی ہے پٹیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو اسے نہیں ملتی۔ ہم نے بہت جتن کئے ہیں اسے ڈھونڈنے کے لئے لیکن ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلوؤں میں ماری گئی ہے۔ لیکن یہ بڑھیا نہیں مانتی —!

دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اڈے پر دیکھا اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔

اس کے ہونٹوں پر موٹی موٹی پپڑیاں جمی تھیں بال سادھوؤں کے سے بنے تھے میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے چنانچہ میں نے اس سے بہت سنگدل بن کر کہا۔

"مائی تیری لڑکی قتل کر دی گئی تھی۔"

پگلی نے میری طرف دیکھا

"قتل — نہیں نہیں —"

اس کے لہجے میں فولادی تیقن پیدا ہو گیا — "اُسے کوئی قتل نہیں کر سکتا — میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا —"

اور وہ چلی گئی۔ —

اپنی موہوم تلاش میں —!

میں نے سوچا — "ایک تلاش اور پھر موہوم — لیکن پگلی کو کیوں اتنا یقین ہے کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی کوئی تیز دھار چھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا —

کیا وہ امر تھی — اس کی ماتا امر تھی — ماتا تو خیر امر ہوتی ہے — پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی ہے — کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا —؟

تیسرے پھیرے پر پھر میں نے اسے دیکھا — اب وہ بالکل چیتھڑوں میں تھی۔ قریب قریب ننگی — میں نے اسے کپڑے دیئے — لیکن اس نے قبول نہ کئے — میں نے اس سے کہا۔ "مائی میں سچ کہتا ہوں تیری لڑکی پٹیالہ ہی میں قتل کر دی گئی تھی۔"

اس نے پھر اسی فولادی تیقن کے ساتھ کہا۔ "تو جھوٹ کہتا ہے"

میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر کہا۔

"نہیں میں سچ کہتا ہوں کافی رو پیٹ لیا ہے تم نے — چلو میرے ساتھ میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔"

اس نے میری بات نہ سنی اور بڑبڑانے لگی — بڑبڑاتے بڑبڑاتے وہ ایک دم چونکی — اب اس کے لہجے میں تیقن فولاد سے بھی زیادہ ٹھوس تھا۔

"نہیں میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔"

"میں نے اس سے پوچھا ——— "کیوں۔؟"

بڑھیا نے ہوتے ہوئے کہا ——— "وہ خوبصورت ہے ——— اتنی خوبصورت کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا ——— اسے کوئی طمانچہ تک نہیں مار سکتا ———"

میں سوچنے لگا ——— "کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی۔ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہوتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی درحقیقت خوبصورت ہو۔

مگر اس طوفان میں کون سی خوبصورتی ہے جو انسان کے کھردرے ہاتھوں سے بچی ہے ——— ہو سکتا ہے بڑھیا اس خیال خام کو دھوکہ دے رہی ہے ——— فرار کے لاکھوں رستے ہیں ——— دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے گرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بن لیتا ہے۔

بارڈر کے اس پار کئی پھیرے ہوئے۔

ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا ——— اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی ——— بینائی کمزور ہو چکی تھی ——— ٹٹول کر چلتی تھی۔ مگر اس کی تلاش جاری تھی ——— بڑی شد و مد سے اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا ——— کہ اس کی بیٹی زندہ ہے ——— اس لئے۔ کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا ———"

بہن نے مجھ سے کہا۔ کہ۔ "اس عورت سے مغز ماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانہ میں داخل کرا دو ———"

میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں اس موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی ——— میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا ——— میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی۔ اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔"

آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ——— میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کروا دوں گا۔"

وہ فرید کے چوک میں کھڑی اپنی نیم اندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

چوک میں کافی چہل پہل تھی۔ میں بہن کے ساتھ ایک دوکان پر بیٹھا ایک معزز لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا ——— جس کے متعلق ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صابونیاں میں ایک ہندو بنیے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ سچ کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لئے آمادہ کروں کہ ایک جوڑا ادھر سے گزرا ——— عورت نے گھونگھٹ کاڑھا ہوا تھا ——— چھوٹا سا گھونگھٹ ——— اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان

تھا۔ بڑا چھیل چھبیلا ـــ بڑا تندرست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا۔

جب یہ دونوں اس پگلی کے پاس سے گزرے تو نوجوان ایک دم ٹھٹک گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا ـــ کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونگھٹ اٹھایا۔ لٹھے کی دھلی ہوئی چادر پر چوکھٹے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

میں ان کے بالکل پاس تھا ـــ سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"تمہاری ماں ـــ"

لڑکی نے ایک لحظے کے لئے پگلی کی طرف دیکھا اور گھونگھٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھینچے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چلو ـــ"

اور وہ دونوں سڑک سے ادھر ذرا ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے پگلی چلائی ـــ"

"بھاگ بھری ـــ بھاگ بھری۔"

وہ سخت مضطرب تھی ـــ میں نے پاس جا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے مائی۔"

وہ کانپ رہی تھی۔ "میں نے اس کو دیکھا ہے۔ میں نے اس کو دیکھا ہے"

میں نے پوچھا کیسے۔؟

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھیلے متحرک تھے ـــ!

"اپنی بیٹی کو ـــ بھاگ بھری کو ـــ"

میں نے پھر اس سے کہا ـــ "وہ مر کھپ چکی ہے مائی۔"

اس نے چیخ کر کہا۔ "تم جھوٹ کہتے ہو۔"

میں نے اس مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا۔ "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ وہ مر چکی ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک میں ڈھیر ہو گئی۔

خط اور اس کا جواب

منٹو بھائی!

تسلیمات! میرا نام آپ کے لئے بالکل نیا ہو گا — میں کوئی بہت بڑی ادیبہ نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھار افسانہ لکھ لیتی ہوں — اور پڑھ کر پھاڑ پھینکتی ہوں۔ لیکن اچھے ادب کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کوشش میں کامیاب ہوں میں اور اچھے ادیبوں کے ساتھ آپ کے افسانے بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں آپ سے مجھے ہر بار نئے موضوع کی امید رہی اور آپ نے درحقیقت ہر بار نیا موضوع پیش کیا لیکن جو موضوع میرے ذہن میں ہے وہ کوئی افسانہ نگار پیش نہ کر سکا یہاں تک کہ سعادت حسن منٹو بھی جو نفسیات اور جنسیات کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے وہ موضوع آپ کی کہانیوں کے موضوعات کی قطار میں ہو اور کسی وقت بھی آپ اسے اپنی کہانی کے لئے منتخب کر لیں لیکن پھر سوچتی ہوں کہ ہو سکتا ہے سعادت حسن منٹو ایسا بے رحم افسانہ نگار بھی اس موضوع سے چشم پوشی کر جائے۔ اس لئے کہ اس موضوع کو ننگا کرنے سے ساری قوم ننگی ہوتی ہے۔ اور شاید منٹو قوم کو ننگا دیکھ نہیں سکتا۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے پیش نظر میں اس خط کو الجھانا نہیں چاہتی اور صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ وہ موضوع ہے۔

ہمارے ماحول کے مردوں کا کم عمر لڑکوں کے ساتھ غیر فطری تعلق۔ مختصر الفاظ میں آپ کوئی بھی اصطلاح دے سکتے ہیں۔

میرا لب لباب یہی تھا — میں بہت عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ اس بارے میں آپ کو خط لکھوں اور آخر جرأت کر لی۔ سوائے منٹو کے اور کوئی اس موضوع کو بے نقاب نہیں کر سکتا — اگر میرے قلم میں زور ہوتا تو میں نے کبھی کی کہانی لکھی ہوتی —

والسلام

آپ کی بہن (میں یہاں اصل نام نہیں دے رہا)

نزہت شیریں بی اے

جب مجھے یہ خط ملا تو میں سوچنے لگا۔ کہ یہ لڑکی کون ہے۔ میں کہاں کا ماہر نفسیات اور جنسیات ہوں کہ اس نے مجھ سے رجوع کیا۔

جب یہ خط ملا تو اتفاق سے میرے دوست۔ جو علم نجوم اور دست شناسی سے شغف رکھتے ہیں اس کے علاوہ رمل اور جفر کے علم میں بھی طالب علم ہیں

تو میں نے انہیں یہ خط پڑھنے کے لئے دیا اور کہا

"وارثی صاحب میں نے اس کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ محفوظ ہے"

میرے ایک اور دوست جن کا نام دوست محمد ہے۔ ان سے میں اپنی رائے بیان کر چکا تھا۔

وارثی صاحب نے یہ خط پڑھا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کے کہا "یہ عورت اگر واقعی عورت ہے اور شادی شدہ ہے جو کہ ہونا چاہیئے تو اس کے خاوند کو اغلام بازی کا شوق ہے"

میں نے دوست محمد سے یہی کہا تھا۔ اپنی بیوی سے بھی ۔۔۔ مگر وہ مانتے نہیں تھے ۔۔۔ میری بہت سی باتیں لوگ نہیں مانتے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں ۔۔۔ کوئی ولی بھی نہیں ۔۔۔ لیکن اپنی استطاعت کے مطابق لوگوں کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں ۔۔۔"

میں نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا تھا ۔۔۔ جو میرے دوست وارثی صاحب نے کیا۔ میں نے ان سے اور دوست محمد سے مشورہ کیا کہ میں اس عورت کے خط کا کیا جواب دوں ۔۔۔!

وارثی صاحب نے کہا۔

"منٹو صاحب ۔۔۔ آپ ہم سے پوچھتے ہیں ایسے خطوں کا جواب دینا آپ ہی کا کام ہے۔"

میں نے ان سے کہا ۔۔۔ "وارثی صاحب میرے لئے یہ بہت مشکل ہے

میں کوئی ڈاکٹر یا حکیم نہیں ۔۔۔ میں تو صاف صاف لفظوں میں جو کچھ مجھے کہنا ہوگا۔ لکھ دوں گا۔"

انہوں نے کہا تو لکھ دو ۔۔۔"

"عورت ذات ہے کیسے لکھوں۔"

"جب وہ لکھتی ہے کہ مردوں کا کم عمر لڑکوں کے ساتھ غیر فطری تعلق ہوتا ہے تو آپ کیوں اس کے جواب میں ایسے ہی الفاظ میں مناسب و موزوں جواب نہیں دیتے۔"

میں نے ان سے کہا۔ "مجھے ایسے مناسب و موزوں الفاظ نہیں ملتے جن میں ان کا جواب لکھ سکوں۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ میں خود کو عاجز سمجھ رہا تھا ۔۔۔ لیکن دوست محمد نے کہا ۔۔۔ "منٹو صاحب آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں قلم پکڑیئے اور جوابی خط لکھ ڈالیئے۔!"

میں نے قلم پکڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔

"خاتون محترم!

میں آپ کو اپنی بہن بنانے کے لئے تیار نہیں اسلئے کہ مجھ پر بہت سے فرائض عائد ہو جائیں گے آپ میرے لئے خاتون محترم ہی رہیں گی اس لئے کہ یہ رشتہ زیادہ مناسب و موزوں ہے۔

مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے ہوسکتا ہے کہ آپ کسی مرد کے بھیس میں

عورت بنی ہوں لیکن میں آپ کی تحریر پر اعتبار کر کے آپ کو ایک عورت تسلیم کرتا ہوں ــــ

آپ کے خط سے جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے۔ وہ میں مختصراً عرض کئے دیتا ہوں ــــ

میں یقیناً بہت بے رحم افسانہ نگار ہوں ــــ میرے سامنے لاکھوں موضوعات پڑے ہیں اور جب تک میں زندہ ہوں پڑے رہیں گے۔ سڑک کے ہر پتھر پر ایک افسانہ کندہ ہوتا ہے لیکن میں کیا کروں اگر کسی خاص جیتے جاگتے موضوع پر لکھوں تو مقدمے کا خوف لاحق ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ مجھ پر اب تک چھ مقدمے چل چکے ہیں۔ فحش نگاری کے سلسلے میں ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں فحش نگار کیسے قرار دیا جاتا ہوں جب کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک بھی گالی کسی کو نہیں دی کسی کی ماں بہن کی طرف بری نظروں سے نہیں دیکھا ــــ خیر یہ میرا اور قانون کا آپس کا جھگڑا ہے آپکو اس سے کیا واسطہ۔

میں یقیناً بے رحم افسانہ نگار ہوں (جن معنوں میں آپ نے "بے رحم" استعمال کیا ہے) آپ نے جس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ میں شاید آپ کے پیش نظر موضوع سے چشم پوشی نہ کر جاؤں تو یہ غلط ہے۔

میں علامہ اقبال مرحوم کے اس قول کا قائل ہوں کہ ؎
اگر خواہی حیات اندر خطر زی

والہ حیات

میں نے تو اپنی ساری زندگی اس شعر کی تقلید سے پہلے خطروں میں ہی گزاری ہے اور اب بھی گزار رہا ہوں۔

جو موضوع آپ کے ذہن میں ہے ــــ کوئی نیا نہیں ہے۔ عصمت چغتائی اپنے مشہور افسانے "لحاف" میں لکھ چکی ہے کہ ایک عورت (کو) کے خاوند کو اغلام بازی کی عادت تھی اس کا رد عمل یہ ہوا کہ اس عورت نے دوسری عورتوں سے ہم جنسی شروع کر دی۔

جہاں مردوں میں ہم جنسیت ہے وہاں عورتوں میں بھی ہے۔ میں آپ کو ایک زندہ مثال پیش کرتا ہوں ــــ

بیگم پارہ (فلم ایکٹرس) کو تو آپ جانتی ہوں گی ــــ اس کا تعلق پرتما داس گپتا سے ہے۔

آپ لکھتی ہیں ــــ "ہمارے ماحول کے مردوں کا کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلق ــــ"

میں آپ سے عرض کروں۔ جہاں تک میں یہ سمجھتا ہوں کوئی چیز غیر فطری نہیں ہوتی ــــ انسان کی فطرت میں برا سے برا اور اچھے سے اچھا فعل موجود ہے۔ اس لئے یہ کہنا نادرست ہے کہ انسان کا فلاں فعل غیر فطری ہے۔

انسان کبھی فطرت کے خلاف جا ہی نہیں سکتا ــــ جو اس کی فطرت ہے وہ اسی کے اندر رہ کر تمام اچھائیاں اور برائیاں کرتا ہے۔

"مجھے معلوم نہیں۔ آپ شادی شدہ ہیں یا کنواری ـــــ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی تلخ تجربہ ہوا ہے جس کی بناء پر آپ نے مجھے یہ خط لکھا۔

امرد پرستی آج سے نہیں ہزارہا سال سے قائم ہے لیکن آجکل اس کا رجحان قریب قریب غائب ہوتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں میدان عمل میں آگئی ہیں۔

جب مرد پرستی زوروں پر تھی تو اس وقت عورتیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی تھیں مرد بھٹکتے بھٹکتے بقول آپ کے کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلقات قائم کرلیتے تھے مگر اب یہ رجحان بہت حد تک کم ہوگیا ہے۔

آپ عورت ہیں ـــــ اس لئے آپ کو معلوم نہیں کہ یہ کم عمر لونڈے اب آپ کے رقیب نہیں رہے ـــــ میں آپ سے ایک اور بات کہوں جس چیز کی طلب ہو ـــــ وہی منڈی میں آتی ہے ـــــ پہلے طلب چھوکروں کی تھی ـــــ اب چھوکریوں کی ہے۔

آپ یقیناً جانتی ہوں گی کہ آج کل حوّا کی بیٹیاں ٹانگے میں سوار شکار میں مصروف ہوتی ہیں۔

میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں ـــــ ایک زمانہ تھا آج سے بیس بائیس برس پیچھے جب لاہور میں ایک سکھ لڑکا منی سنگھ ہوتا تھا ـــ بڑا خوبصورت ـــ اس کے خدوخال کے سامنے کسی بھی حسین لڑکی کے نقش ماند پڑ جاتے اس نے لاہور میں ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ اس کے عاشق نے اس کو ایک موٹر کار دے دی تاکہ اسے گورنمنٹ کالج جانے اور گھر آنے تک میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

میں اب آپ کو کتنے قصّے سناؤں ـــ امرتسر میں دجہاں کا میں رہنے والا ہوں) میرا ایک ہندو دوست ہے اچھی شکل وصورت کا تھا ـــ ہم دونوں بیٹھک میں باتیں کر رہے تھے جو اندر گلی میں تھی اس نے ایک دم مجھ سے چونک کر کہا۔

"یار باہر بہت شور ہو رہا ہے چلو ـــ"

میں کانوں سے ذرا بہرہ ہوں ـــــ مجھے شور ودر کوئی سنائی نہیں دے رہا تھا بہرحال اس کے ساتھ ہولیا ـــ ہم باہر نکلے تو بازار کی تمام دکانیں بند تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کی کسی تحریک کے باعث ہڑتال ہو گئی ہے۔

چند غنڈے ہاتھ میں ہاکیاں لئے پھر رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس آئے ایک غنڈے کو میں نے پہچان لیا ـــــ بڑا خطرناک تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے میرے ہندو دوست منوہر سے کہا۔

"باؤجی ـــــ آپ اندر چلے جائیں ـــــ ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی اور نقصان پہنچ جائے۔"

منوہر اور میں واپس گھر چلے گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "یہ

قصہ کیا ہے۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ دو آدمی اس سے عشق کرتے ہیں ——— وہ بڑا صاف گو تھا۔

ایک پڑنگوں کے محلے کا تھا دوسرا فرید کے چوک کا۔ منوہر پڑنگ سے ناحق تھا اسلئے ان دونوں میں لڑائی ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شام تک گیارہ آدمی زخمی ہو کر ہسپتال میں تھے اور منوہر بالکل ہی ٹھیک ٹھاک تھا۔

"اب مجھے آپ سے یہ کہنا ہے ——— بلکہ پوچھنا ہے کہ آپ نے مردوں کا کم عمر لڑکوں سے غیر فطری تعلق کیسے جانا۔"

جیسا کہ میں نے اور میرے دوست وارثی صاحب نے سوچا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کا شوہر ایسے شغل کرتا ہوگا۔ آپ مجھے اس کے متعلق ضرور لکھئے گا ——— میں یہ بھی جانتا کہ آپ شادی شدہ ہیں ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو ——— !

دیکھئے! میں آپ سے ایک بات عرض کردوں ——— قریب قریب ہر لڑکا جوانی کے ایام میں ایسی حرکتیں کرتا ہے ہو سکتا ہے آپ نے اپنے لڑکے کے متعلق ہی لکھا ہو ——— اسے تنبیہ کر دینا کافی ہے ——— یا اس کی شادی کر دینا چاہیئے کیونکہ ہر عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے اور یہ ایک خوفناک چیز ہے۔

جنس کا احساس صرف بالغ آدمیوں ہی میں نہیں چھوٹے چھوٹے بچوں میں

ہوتا ہے۔ میں اس کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اردو زبان اس کی متحمل نہیں ہوگی۔

آپ نے جو مجھے چیلنج دیا ہے۔ قبول ہے۔ میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ جو موضوع آپ نے بتایا ہے اس پر کوئی افسانہ لکھوں ——— اب یقیناً لکھوں گا۔ چاہے ایک مقدمہ اور چل جائے۔

آپ مجھے اپنے متعلق تفصیل سے لکھئے تاکہ میں کوئی اندازہ کر سکوں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

موج دین

رات کی تاریکی میں سنٹرل جیل کے دو وارڈن بندوق لئے چار قیدیوں کو دریا کی طرف لے جا رہے تھے۔ جن کے ہاتھ میں کدالیں اور بیلچے تھے پل پر پہنچ کر انہوں نے گارد کے سپاہی سے ڈبیا لے کر لالٹین جلائی اور تیز تیز قدم بڑھاتے دریا کے کنارے جا رہے تھے۔

کنارے پر پہنچ کر انہوں نے بارہ دری کی بغل میں کدالیں اور بیلچے پھینکے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں اس طرح تلاش شروع کی جیسے وہ کسی مدفون خزانے کی کھوج میں آئے ہوں ایک قیدی نے لالٹین تھامے وارڈن کو داروغہ جی کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”داروغہ جی — یہ جگہ مجھے پسند ہے۔ اگر حکم ہو تو کھدائی شروع کر دیں۔“

”دیکھنا زمین نیچے سے پتھریلی نہ ہو — ورنہ ساری رات کھدائی میں گزر جائے گی۔ کمبخت کو مرنا بھی رات کو ہی تھا — وارڈن نے تحکمانہ اور بیزارگی کے لہجے میں کہا۔

قیدیوں نے کدالیں اور بیلچے اٹھائے اور کھودنا شروع کیا وارڈن بیزاری کے موڈ میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے قیدی زمین کھودنے میں ہمہ تن مصروف تھے رفتہ رفتہ زمین پر کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر لگ گیا اور وارڈن نے قریب آ کر قبر کا معائنہ کیا زمین چونکہ پتھریلی نہیں تھی اس لئے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پینے لگا جسے سلگانے کے لئے اس نے لالٹین منگائی۔

کھدائی قریب قریب ختم ہو چکی تھی وارڈن دو قیدیوں کو لئے جیل کی جانب چلا گیا اور بیس منٹ کے وقفے کے بعد کمبل میں لپٹی ہوئی قیدی کی لاش لے کر واپس آیا۔

دوسرا وارڈن جب تک سلیس جمع کر کے لایا تھا۔

ایک قیدی نے جو قتل کے جرم کی پاداش میں سزا کاٹ رہا تھا کدالیں اور بیلچے اٹھائے اور قبر کے سرہانے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

وارڈن نے بہت ہی برہم لہجے میں کہا اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ابے الو کے پٹھے اپنے ابا کو لحد میں اتارنے میں ان کی مدد کر —

قیدی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا — داروغہ جی! لالٹین پکڑتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ اس معصوم اور بے گناہ کو ایک قاتل کے ہاتھ چھو جائیں —

نارڈن یہ سن کر گرجا۔۔۔ بے گناہ کے بچے ۔۔۔ جاسوس کو معصوم کہتا ہے"

قاتل نے کہا۔" وارد غرجی۔۔۔ میں قاتل ہوں ۔۔۔ یہی احساس مجھے اس قیدی کی لاش چھونے سے روکتا ہے۔

"جاسوس" دفنایا جا چکا تھا۔ قیدی اور وارڈن جا چکے تھے صبح آٹھ بجے پولیس کی معیت میں ڈپٹی کمشنر قبر پر آیا جیل کے حکام کے بیانات لئے گئے۔ اور ڈپٹی کمشنر صاحب عدالت تشریف لے گئے۔

پیشی کی پہلی مثل جو اٹھائی گئی اس پر "سرکار بنام موج دین" لکھا تھا۔

اردلی نے تین مرتبہ کمرہ عدالت سے باہر نکل کر بلند آواز میں تین بار پکارا بلکہ یوں کہیئے کہ للکارا۔۔۔" سرکار بنام موج دین ۔۔۔ موج دین۔ موج دین ہے ۔۔۔" لیکن یہ آواز بدقسمتی سے اس "جاسوس" قیدی کی قبر تک نہ پہنچ سکی یا اگر پہنچی بھی ہو تو وہ تعمیل کے لئے نہ آیا شاید یہ سمجھ کر وہ اب ڈپٹی کمشنر کے قانون کی زد سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی اور قانون چلتا ہے جہاں ڈپٹی کمشنر کے سمن کی بھی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

ملزم چونکہ غیر حاضر تھا اس لئے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے عدم حاضری ملزم کارروائی یکطرفہ کے لئے مثل اٹھائی اور ریڈر سے جرم کی نوعیت پوچھی

"جاسوسی ۔"

منشی نے نمبرا کی کارروائی لکھتے ہوئے کہا۔

ملزم رات کو سنٹرل جیل میں فوت ہو چکا ہے۔ مثل داخل دفتر کر دی جائے۔

ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا۔

جاسوس کی سنٹرل جیل میں موت کی خبر شہر بھر میں اس لئے مشہور ہو گئی کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر اور پولیس کے افسروں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ آزاد کشمیر حکومت کے زیرک سیرت افسروں کی ہر طرف سے داد تحسین دی جا رہی تھی۔ مجھے جب اس واقعہ کا علم ہوا تو مجھے ایک مہینہ پہلے کی ایک شام یاد آئی جبکہ میں دارالحکومت کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ڈاک گاڑی کا انتظار کر رہا تھا جس کے ذریعے سے مرمت شدہ جوتے راولپنڈی سے آنے والے تھے۔ گاڑی آنے میں خلاف معمول دیر ہو گئی میں قریب قریب اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک اکہرے سانولے رنگ کے آدمی نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"آپ بوت یم سے بیٹھا کسی کا انتظار کرتا ہے ۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

"بھئی عجیب مصیبت ہے۔ جوتا پھٹ جائے مظفر آباد میں ۔۔۔ تو مرمت کے لئے راولپنڈی بھیجنا پڑتا ہے یا اگر کوئی ڈرائیور مہربان ہو تو اسی کے ہاتھ بھیج دیتے ہیں آج میں اپنے مرمت شدہ جوتوں کے انتظار میں تین گھنٹے سے بیٹھا ہوں اور کمبخت ڈاک گاڑی بھی آج ہی لیٹ ہوئی ہے خیر کل ہی ۔۔۔"

میں یہ کہہ کر اٹھنے لگا۔ تو اس نے مجھے چند منٹ مزید انتظار کرنے کیلئے کہا۔

میں اس اجنبی صورت کو دیکھتا رہا جس کی آنکھوں میں اضطراب تھا جس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے بیتاب تھے۔

وہ بیڑی پر بیڑی پئے جارہا تھا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا بار بار باہر خلا میں دیکھتا تھا میں ڈاک گاڑی کے انتظار میں ہر ایک ہارن پر کان دھرتا وقت گزارنے کے لئے میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم بیٹھا ہے —" اس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا

"نہیں — میرا مطلب ہے یہاں آپ کا کیا کاروبار ہے۔"

"کاروبار کچھ نہیں کرتا — کشمیر دیکھنے کا شوق تھا۔ چلا آیا۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"لاہور سے — لیکن میں مشرقی پاکستان کا ہوں — لاہور میں دینیات کی تعلیم پڑھتا ہوں —"

مجھے گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ وہ جس ادارے میں زیر تعلیم ہے خیراتی ادارہ ہے جہاں کے ارباب اعلیٰ رسید بک چھاپ کر زیر تعلیم کم عمر بچوں کو چندے کی فراہمی کے لئے دوسرے شہروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ چونکہ کم عمر بچہ نہ تھا۔ اس لئے اس کو بڑی مشکلوں کے بعد "سفیر" بن کر آزاد کشمیر میں چندہ جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کی باتوں میں سادگی تھی محض کشمیر دیکھنے کے شوق میں اس نے سفارت حاصل کی تھی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یتیم خانوں کے

نام پر بھیک منگوں کے نام اداروں نے مقرر کر رکھا ہے۔ جمع شدہ چندہ ان کی جیبوں میں جاتا ہے اور سفیر کا گزارہ چڑھاوے کی دیگوں یا محلے والوں کی خیرات پر ہوتا ہے۔ دینیات کی تعلیم مساجد میں دی جاتی ہے۔

مجھے اس کی باتیں سن کر بہت دکھ ہوا واقعی وہ ہمدردی کے قابل تھا اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شہر میں نیا ہے اور کسی مسجد کا پتا بھی نہیں جانتا جہاں وہ رات بسر کر سکے۔ میں نے مسجد کا پتہ دیا۔ اور اس کے لئے روٹی منگوائی وہ چونکہ بھوکا تھا اس نے بلا تکلف بجائے روٹی کے سادہ چاول کے لئے بیرے سے کہا۔

"ہم لاہور کی مسجد میں بھی لوگوں کا دیا کھاتا ہوں — اس لئے ادھر بھی ہم نے انکار نہیں کیا —" اس نے انتہائی سادگی سے کہا۔

وہ کھانا کھا چکا تھا مجھ سے اجازت لے کر اس نے جیب سے لکھنے کے لئے پنسل اور کاغذ نکالا اور اپنے گھر والوں کو بنگلہ زبان میں خط لکھنے لگا۔ میں جب تک زیبائشی گانے سنتا رہا۔ خط لکھنے کے بعد اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔ کہ میں نے گھر والوں کو لکھا کہ میں آزاد کشمیر آیا ہوں اور اب یہیں رہوں گا۔ اگر پاکستان نے ہندوستان کے خلاف جہاد شروع کیا تو میں بھی اس میں حصہ لوں گا۔ اور کشمیر کو آزاد کراؤں گا۔

میں نے جواب میں ہندی مقبوضہ کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کیا کشمیری مسلمانوں پر بھارتی ظلم و استبداد بیان کیا۔ جس سے وہ اور زیادہ متاثر ہوا

"پھر ہم لاہور واپس جائے گا۔ کل ان کو بھی خط لکھے گا۔ جہاد شروع

ہونے تک ادھر ہی پان بیڑی کی چھابڑی لگائے گا ——— اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں ڈاک گاڑی آگئی اور میں وہاں سے اٹھ کر لاریوں کے اڈے کی طرف گیا اور وہ میرے بتائے ہوئے راستے سے مسجد کی طرف گیا اپنے جہتے ڈرائیور سے لے کر جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں سی آئی ڈی کے ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے آواز دی جو میرا واقف کار تھا میں نے رسمی طور پر اس کی خیریت پوچھی وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

رسمی باتوں کے بعد اس نے مجھے اس کالے آدمی کے متعلق پوچھا کہ وہ کون ہے جو آپکے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا تھا۔

میں نے مختصراً کہا ——— بھئی بنگالی ہے۔ آزاد کشمیر دیکھنے کا شوق تھا چلا آیا نام موحدین ہے اور آج رات جامع مسجد میں گزارنے کے لئے گیا ہے۔"

لیکن وہ تو ہوٹل میں بیٹھا کچھ عجیب و غریب زبان میں خط لکھ رہا تھا مجھے اس پر کچھ شبہ بھی ہوا ——— ہیڈ کانسٹیبل نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

وہ عجیب و غریب زبان نہیں ——— اسکی مادری زبان بنگلہ ہے۔ ہاں تمہارے لئے اجنبی ہے۔"

اتنے میں میرا مکان قریب آیا اور میں خدا حافظ کہہ کر گھر چلا گیا مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ سی آئی ڈی والوں نے دن کی کارگزاری کی رپورٹ دوسرے روز صبح سویرے دفتر میں دینا ہوتی ہے اور اگر رپورٹ نہ دی گئی تو جواب طلبی ہوتی ہے

ہیڈ کانسٹیبل صاحب کو بھی دن کی کارگزاری میں کچھ نہ کچھ دکھانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے گھر جا کر حکومت کے صدر مقام میں ایک غیر ملکی جاسوس کی آمد کی رپورٹ اس طرح دی کہ دوسرے روز موحدین پالفروشی کے لئے کتھا چونا خریدتا ہوا گرفتار کیا گیا ——— پان چونا کتھا وغیرہ بھی اس کی جاسوسی کی ایک کڑی بن گئی اور سی آئی ڈی والوں نے مزید رپورٹ دے دی۔ کہ جاسوس چونکہ پان کھانے کا عادی ہے۔ اس لئے یہ اسٹاک خرید کر ہماری فوجوں کی چوکیوں کی پوزیشن دیکھنے پہاڑی علاقوں میں جا رہا ہے۔

موحدین کا چالان ہوا ——— ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے الزامات کی سنگینی کے تحت جاسوس کو پندرہ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے وہ اسپیشل سٹاف میں منتقل ہوا۔ پندرہ دن کی مدت گزر جانے پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتہ کے ریمانڈ پر اس کو جوڈیشل سنٹرل جیل بھیج دیا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور جاسوس ہتھکڑیاں پہنے ڈپٹی کمشنر صاحب کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں وہ زار و قطار رویا۔ گڑگڑایا۔ منت سماجت کی لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب نے مزید ایک ہفتے کا ریمانڈ دے کر سنٹرل جیل بھیج دیا۔ سنٹرل جیل میں اس کی آخری رات تھی جبکہ وہ ایک ستون سے بندھا رو رہا تھا۔ وہی قاتل قیدی جس نے اس کو ڈنڈے وقت چھونے سے انکار کر دیا اس کے قریب آیا اور پوچھا۔

"جاسوس ——— " تم ہر روز کیوں روتے ہو۔ یہ جگہ باہر والوں کی نسبت

بہت اچھی ہے یہاں جھوٹ نہیں مکر نہیں بے ایمانی نہیں روٹی ملتی ہے اس کے مقابلے میں باہر دیکھو ـــــ کون لوگ ہیں جنہوں نے تم ایسے بے گناہ کو بھی یہاں بھیجا جو امانت دار کے لئے ایک کا نہیں ہزاروں کا خون بہاتے ہیں جو دن دہاڑے ڈاکہ ڈالتے ہیں ـــــ جو اپنی ذات کے لئے وہ کام بھی کرتے ہیں جو شیطان بھی کرنے سے گریز کرتا ہے ـــــ مجھے دیکھو ـــــ میں نے قتل کیا ہے ـــــ محض ایک بے بس عورت کے ناموس کے تحفظ کے لئے ـــــ!

بہر حال مجھے تم سے ہمدردی ہے اگر تم باہر جاکر خوش ہو تو خدا تمہیں آزاد کرائے گا۔"

موحدین نے قیدی کی باتیں سنیں ـــــ اور بالکل خاموش بیٹھا رہا

"سنا ہے بنگالی جادو جانتے ہیں ـــــ تم بھی جادو کے زور سے باہر چلے جاؤ ـــــ"

قیدی نے موحدین کو بہلانے کے لئے ازراہِ مذاق کہا۔

"ہاں ـــــ میں اس قید سے رہائی کا جادو جانتا ہوں ـــــ میں آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا ـــــ بہت دور جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے واپس نہیں لا سکتی۔"

اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی قیدی اپنی تھالی لئے دال روٹی لینے گیا آدھے گھنٹہ کے بعد اچانک جیل کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی اور متواتر بجتی رہی۔ داروغہ جیل کئی وارڈنوں کے ساتھ جیل کے احاطہ میں داخل ہوا اور جاسوس کے گلے کا رسی کا پھندا کھولا جو اس نے خودکشی کے لئے استعمال کیا تھا۔ جاسوس بھاگ چکا تھا اس کو رہائی مل گئی تھی۔

بنگال کا جادو کام آیا تھا۔

موحدین کی لاش کے اردگرد قیدیوں کا ہجوم تھا داروغہ جیل نے چند ایک قیدیوں کو وہاں ٹھہرنے کا حکم دے دیا۔ اور باقی سارے قیدی بارکوں میں چلے گئے موحدین کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس قانون پر مسکرا رہا تھا جس نے اس کو جاسوس بنا کر محبوس کیا تھا۔

٭

عظیم نے دس گانے لکھے جن میں سے سیٹھ نے چار پسند کیے۔ بھٹاوڑے نے موسیقی کے لحاظ سے صرف دو ان کی اس نے عظیم کے اشتراک سے دھنیں تیار کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

پندرہ بیس روز تک ریہرسلیں ہوتی رہیں فلم کا پہلا گانا کورس تھا اس کے لئے کم از کم دس گویا لڑکیاں درکار تھیں پروڈکشن منیجر سے کہا گیا مگر جب وہ انتظام نہ کر سکا تو بھٹاوڑے نے مس مالا کو بلایا جس کی اچھی آواز تھی اس کے علاوہ پانچ چھ اور لڑکیوں کو جانتی تھی جو سُر میں گا لیتی تھیں مس مالا کھانڈ یکر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ کولہاپور کی مرہٹہ تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کا اردو کا تلفظ زیادہ صاف تھا ــــ اس کو یہ زبان بولنے کا شوق تھا۔ عمر کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے کا ہر خدوخال اپنی جگہ پر پختہ باتیں بھی اسی انداز میں کرتی کہ معلوم ہوتی اچھی خاصی عمر کی ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر ہے۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کو وہ بھائی جان کہتی اور ہر آنے جانے سے والے سے وہ بہت جلد ہی گھل مل جاتی تھی۔!

اس کو جب بھٹاوڑے نے بلایا تو وہ بہت خوش ہوئی اس کے ذمے یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ فوراً کورس کے لئے دس گانے والی لڑکیاں مہیا کر دے وہ دوسرے روز ہی بارہ لڑکیاں لے آئی۔ بھٹاوڑے نے ان کا ٹسٹ لیا مات کام کی نکلیں باقی رخصت کر دی گئیں اس نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے سات ہی

ایک بھائی ایک واعظ

گانے وانے لکھنے والا عظیم گوبند پوری جب اے بی سی پروڈکشنز میں ہوا تو اس نے فوراً اپنے دوست میوزک ڈائرکٹر بھٹاوڑے کے متعلق سوچا جو مرہٹہ تھا عظیم کے ساتھ کئی فلموں میں کام کر چکا تھا وہ اس کی اہلیتوں کو جانتا تھا سٹنٹ فلموں میں آدمی اپنے جوہر کیا دکھا سکتا ہے بے چارہ گمنامی کے گوشے میں پڑا تھا۔

عظیم نے چنانچہ اپنے سیٹھ سے بات کی اور کچھ اس انداز میں کی کہ اس نے بھٹاوڑے کو بلایا اور اس کے ساتھ ایک فلم کا کنٹریکٹ تین ہزار روپوں میں کر لیا۔ کنٹریکٹ پر دستخط کرتے ہی اسے پانچ سو روپے ملے جو اس نے اپنے قرض خواہوں کو ادا کر دیئے عظیم گوبند پوری کا وہ بڑا شکر گذار تھا چاہتا تھا کہ اس کی کوئی خدمت کرے مگر اس نے سوچا کہ آدمی بے حد شریف ہے اور بے غرض ــــ کوئی بات نہیں آئندہ مہینے سہی کیونکہ ہر ماہ اسے کنٹریکٹ کی رو سے ۵ سو روپے ملتے تھے اس نے عظیم سے کچھ نہ کہا۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

کافی ہیں جگتاپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے مشورہ کیا اس نے کہا میں سب ٹھیک کروں گا۔ ایسی ریکارڈنگ کروں گا کہ لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا بس لڑکیاں گا رہی ہیں۔

جگتاپ اپنے فن کو سمجھتا تھا چنانچہ اس نے ریکارڈنگ کے لئے ساؤنڈ پروف کمرے کی بجائے سازندوں اور گانے والیوں کو ایک ایسے کمرے میں بٹھایا جس کی دیواریں سخت تھیں جن پر ایسا کوئی غلاف چڑھا ہوا نہیں تھا کہ آواز دب جائے فلم بے وفا کا مہورت اسی کورس سے ہوا سینکڑوں آدمی آئے ان میں بڑے بڑے فلمی سیٹھ اور ڈسٹری بیوٹرز تھے اے بی سی پروڈکشنز کے مالک نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔

پہلے گانے کی دو چار ریہرسلیں ہوئیں مس مالا کھانڈیکر نے بھٹساوے کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ سات لڑکیوں کو فرداً فرداً آگاہ کیا کہ خبردار رہیں اور کوئی ایسی بات پیدا نہ ہونے دیں بھٹساوے پہلی ہی ریہرسل سے مطمئن تھا لیکن اس نے مزید اطمینان کی خاطر چند اور ریہرسلیں کرائیں اس کے بعد جگتاپ سے کہا کہ وہ اپنا اطمینان کرے اس نے جب ساؤنڈ ٹرک میں یہ کورس پہلی مرتبہ ہیڈ فون لگا کر سنا تو اس نے خوش ہو کر بہت اونچا او کے کہہ دیا ہر ساز اور ہر آواز اپنے صحیح مقام پر تھی۔

مہمانوں کے لئے مائیکروفون کا انتظام کر دیا گیا تھا ریکارڈنگ شروع ہوئی تو اسے اون کر دیا گیا بھٹساوے کی آواز بھونپو سے نکلی سونگ نمبر ایک فرسٹ

ریکی، دن ٹو۔

اور کورس شروع ہو گیا۔

بہت اچھی کمپوزیشن تھی۔ سات لڑکیوں میں سے کسی ایک نے بھی کہیں غلط سُر نہ لگایا مہمان بہت محظوظ ہوئے۔ سیٹھ جو موسیقی کیا ہوتی ہے اس سے بھی قطعاً ناآشنا تھا۔ بہت خوش ہوا اس لئے کہ سارے مہمان اس کورس کی تعریف کر رہے تھے۔ بھٹساوے نے سازندوں اور گانے والیوں کو شاباشیاں دیں خاص طور پر اس نے مس مالا کا شکریہ ادا کیا جس نے اس کو اتنی جلدی گانے والیاں فراہم کر دیں اس کے بعد وہ جگتاپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے گلے مل رہا تھا کہ اے بی سی پروڈکشنز کے مالک سیٹھ رنچھوڑ داس کا آدمی آیا کہ وہ اسے بلا رہے ہیں —— عظیم گوبند پوری کو بھی۔

دونوں بھاگے —— اسٹوڈیو کے اس سرے پر گئے جہاں محفل جمی تھی سیٹھ صاحب نے سب مہمانوں کے سامنے ایک سو روپے کا سبز نوٹ انعام کے طور پر پہلے بھٹساوے کو دیا پھر دوسرا عظیم گوبند پوری کو —— وہ مختصر سا باغیچہ جس میں مہمان بیٹھے تھے تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

جب مہورت کی یہ محفل برخاست ہوئی تو بھٹساوے نے عظیم سے کہا۔

"بال پانی ہے چلو آوٹ ڈور چلیں ——"

عظیم اس کا مطلب نہ سمجھا —— "آوٹ ڈور کہاں"

بھٹساوے مسکرایا۔ "تازے منگے رہیے (لڑکے) موز شوک (موج شوق)

کرنے جائیں گے سو روپیہ تمہارے پاس ہے سو ہمارے پاس۔ چلو۔"

عظیم سمجھ گیا ــــ لیکن وہ اس کے موز شوک سے ڈرتا تھا اس کی بیوی تھی دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی ــــ اس نے کبھی عیاشی نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت وہ خوش تھا اس نے اپنے دل سے کہا۔

"چلو رے دیکھیں گے کیا ہوتا ہے"

بھٹاوڑے نے فوراً ٹیکسی منگوائی دونوں اس میں بیٹھے اور گرانٹ روڈ پہنچے عظیم نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں بھٹاوڑے؟"

وہ مسکرایا ــــ "اپنی موسی کے گھر ــــ"

اور جب وہ اپنی موسی کے گھر پہنچا تو وہ مس مالا کھانڈیکر کا گھر تھا وہ ان دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملی ــــ انہیں اندر اپنے کمرے میں لے گئی ہوٹل سے چائے منگوا کر پلوائی۔ بھٹاوڑے نے اس سے چائے پینے کے بعد کہا۔ "ہم موز شوک کے لئے نکلے ہیں تمہارے پاس ــــ تم ہمارا کوئی بندوبست کرو۔"

مالا سمجھ گئی۔ وہ بھٹاوڑے کی احسان مند تھی۔ اس لئے اس نے فوراً ہی مرہٹی زبان میں کہا۔ جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

دراصل بھٹاوڑے عظیم کو خوش کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ اس نے اس کو ملازمت دلوائی تھی۔ چنانچہ بھٹاوڑے نے مس مالا سے کہا کہ وہ ایک لڑکی مہیا کرے

مس مالا نے اپنا میک اپ جلدی جلدی ٹھیک کیا اور تیار ہو گئی۔ سب ٹیکسی میں بیٹھے پہلے مس مالا اپنے بیک سنگر شانتا کرنا کرن کے گھر گئی مگر وہ کسی اور کے ساتھ باہر جا چکی تھی پھر وہ انسویا کے ہاں گئی مگر وہ اس قابل نہیں تھی کہ ان کے ساتھ ایسی مہم پر جا سکے۔

مس مالا کو بہت افسوس تھا کہ اسے دو جگہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کو امید تھی کہ معاملہ طے ہو جائے گا۔ چنانچہ ٹیکسی گول پیٹھا کی طرف چلی وہاں کرشنا تھی۔ پندرہ سولہ سال کی گھبراتی لڑکی ــــ بڑے نرم و نازک سُر میں گاتی تھی مالا اس کے گھر میں داخل ہوئی اور چند لمحات کے بعد اس کو ساتھ لئے باہر نکل آئی۔ بھٹاوڑے کو اس نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا اور عظیم کو بھی۔ مالا نے ٹھیٹ دلالوں کے سے انداز میں عظیم کو آنکھ ماری اور گویا خاموش زبان میں اس سے کہا۔ "یہ آپ کے لئے ہے"

بھٹاوڑے نے اس پر نگاہوں ہی نگاہوں میں صاد کر دیا۔ کرشنا عظیم گوبند پوری کے پاس بیٹھ گئی چونکہ اس کو مالا نے سب کچھ بتا دیا تھا اس لئے اس نے ٹیکسی ایک پارک کے سامنے ٹھہرائی صرف عظیم کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

نغمہ نگار نے صرف ایک دو مرتبہ پی تھی وہ بھی کاروباری سلسلے میں۔ یہ بھی کاروباری سلسلہ تھا چنانچہ اس نے بھٹاوڑے کے اصرار پر دو پیگ رم کے پئے اور اس کو نشہ ہو گیا۔ بھٹاوڑے نے ایک بوتل خرید کے اپنے ساتھ

رکھ لی اب پھر وہ شیلسی میں تھے۔

عظیم کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا ــــ کہ اس کا دوست بھٹاوے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں بھی ساتھ لایا ہے۔

عظیم کو بعد میں معلوم ہوا کہ بھٹاوے نے پہلے بیک سنگر کرشنا کی ماں سے یہ کہہ دیا تھا کہ جو کورس دن میں لیا گیا تھا اس کے جتنے ٹیک تھے سب خراب نکلے ہیں اس لئے رات کو پھر ریکارڈنگ ہوگی اس کی ماں ویسے کرشنا کو باہر جانے کی اجازت کبھی نہ دیتی مگر جب بھٹاوے نے کہا کہ اسے اور روپے ملیں گے تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ کہ جلدی جاؤ اور فارغ ہو کر سیدھی یہاں آؤ۔ وہاں اسٹوڈیو میں نہ بیٹھی رہنا۔"

ٹیکسی ورلی پہنچی ــــ یعنی ساحل سمندر کے پاس ــــ یہ وہ جگہ تھی جہاں عیش پرست کسی نہ کسی عورت کو بغل میں دبائے آیا کرتے تھے ایک پہاڑی سی تھی۔ معلوم نہیں مصنوعی یا قدرتی ــــ اس پر چڑھے ــــ کافی وسیع و عریض سطح مرتفع قسم کی جگہ تھی۔

اس میں لمبے فاصلوں پر بنچیں رکھی ہوئی تھیں جن پر صرف ایک ایک جوڑا بیٹھتا ــــ سب کے درمیان ان کہا سمجھوتہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملے میں مخل نہ ہوں ــــ بھٹاوے نے جو کہ عظیم کی دعوت کرنا چاہتا تھا ورلی کی پہاڑی پر کرشنا کو اس کے سپرد کر دیا۔ اور خود مالا لے ساتھ ٹہلتا ٹہلتا ایک جانب چلا گیا۔

عظیم اور بھٹاوے میں ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔ عظیم جس نے غیر عورت کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ محسوس کیا تھا جب کرشنا کو اپنے ساتھ لگے دیکھا تو اس کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ کرشنا ٹھیٹ مرہٹی لڑکی تھی سانولی اور سلونی۔ بڑی مضبوط۔ شدید طور پر جوان اور اس میں وہ تمام دعوتیں تھیں جو کسی کھل کھیلنے والی میں ہو سکتی ہیں ــــ عظیم چونکہ نشے میں تھا اس لئے وہ اپنی بیوی کو بھول گیا اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کرشنا کو تھوڑے عرصہ کے لئے بیوی بنائے۔

اس کے دماغ میں مختلف شرارتیں پیدا ہو رہی تھیں کچھ رم کے باعث اور کچھ کرشنا کی قربت کی وجہ سے ــــ عام طور پر وہ بہت سنجیدہ رہتا تھا بڑا کم گو ــــ لیکن اس وقت اس نے کرشنا کے گدگدی کی ــــ اس کو کئی لطیفے اپنی ٹوٹی پھوٹی گجراتی میں سنائے

پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ زور سے بھٹاوے کو آواز دی اور کہا۔

"پولیس آ رہی ہے۔ پولیس آ رہی ہے۔"

بھٹاوے مالا کے ساتھ آیا عظیم کو موٹی سی گالی دی اور ہنسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عظیم نے اس سے مذاق کیا ہے لیکن اس نے سوچا ــــ بہتر یہی ہے کہ کسی ہوٹل میں چلیں جہاں پولیس کا خطرہ نہ ہو ــــ چاروں اٹھ رہے تھے کہ پیلی پگڑی والا نمودار ہوا اس نے ٹھیٹ سپاہیانہ انداز میں پوچھا تم لوگ رات کے گیارہ بجے یہاں کیا کر رہا ہے ــــ مالوم نہیں دس بجے سے پیچھے یہاں بیٹھنا

مکاٹیک نہیں ہے ۔ کانون ہے ۔

عظیم نے سنتری سے کہا۔ " جناب اپن فلم کا آدمی ہے۔ یہ چھوکری اس نے کرشنا کی طرف دیکھا — یہ بھی فلم میں کام کرتی ہے — ہم لوگ کسی برے خیال سے یہاں نہیں آئے یہاں پاس ہی جو اسٹوڈیو ہے اس میں کام کرتے ہیں تھک جاتے ہیں تو یہاں چلے آتے ہیں۔ کہ تھوڑی سی تفریح ہو گئی۔ بارہ بجے ہماری شوٹنگ پھر شروع ہونے والی ہے ۔ "

پیلی پگڑی والا مطمئن ہو گیا پھر وہ بھٹاوے سے مخاطب ہوا " تم ادھر کیوں بیٹھا ہے ۔ "

بھٹاوے پہلے گھبرایا — لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مالا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سنتری سے کہا۔ " یہ ہمارا والف ہے۔ ہمارا ٹیکسی نیچے کھڑا ہے۔ "

تھوڑی سی اور گفتگو ہوئی اور چاروں کی خلاصی ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر سوچا کہ کس ہوٹل میں چلیں عظیم کو ایسے ہوٹلوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا جہاں آدمی چند گھنٹوں کے لئے کسی غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کر سکے بھٹاوے نے بیکار اس سے مشورہ کیا چنانچہ اس کو فوراً ڈوک یارڈ کا سی ویو ہوٹل یاد آیا اور اس نے ٹیکسی والے سے کہا۔ کہ وہاں لے چلو۔ سی ویو ہوٹل میں بھٹاوے نے دو کمرے لئے ایک میں عظیم اور شانتا چلے گئے دوسرے میں بھٹاوے اور مس مالا کھانڈیکر۔ کرشنا بدستور مجسم ولوت تھی

لیکن عظیم حسن نے دو پیگ اور پی لئے تھے تلسی رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اس کو غور سے دیکھا۔ اور سوچا کہ اتنی کم عمر لڑکی نے گناہ کا یہ بھیانک راستہ کیوں اختیار کیا — خون کی کمی کے باوجود اس میں — کی اتنی تپش کیوں ہے کب تک یہ نرم و نازک لڑکی جو گوشت نہیں کھاتی اپنا گوشت پوست بیچتی رہے گی — عظیم کو اس پر بڑا ترس آیا — چنانچہ اس نے واعظ بن کر اس سے کہنا شروع کیا۔

کرشنا معصیت کی زندگی سے کنارہ کش ہو جاؤ — خدا کے لئے اس راستے سے جس پر کہ تم گامزن ہو — اپنے قدم ہٹا لو — یہ تمہیں ایسے مہیب غار میں لے جائیگا جہاں سے تم نکل نہیں سکو گی۔ عصمت فروشی انسان کا بدترین فعل ہے یہ رات اپنی زندگی کی روشن رات سمجھو — اس لئے کہ میں نے تمہیں نیک پند سمجھا دیا ہے۔

کرشنا نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ یہ تھا کہ عظیم اس سے محبت کر رہا ہے چنانچہ وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی اور عظیم اپنا گناہ و ثواب کا مسئلہ بھول گیا۔

بعد میں وہ بڑا نادم ہوا — کمرے سے باہر نکلا تو بھٹاوے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ کچھ اس انداز سے جیسے اس کو بھڑوں کے پورے چھتے نے کاٹ لیا ہے اور ڈنگ اس کے جسم میں کھبے ہوئے ہیں عظیم کو دیکھ کر وہ رک گیا مطمئن کرشنا کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پیچ و تاب کھا کر عظیم سے کہا۔

" وہ سالی چل گئی ۔ "

علیم جو اپنی ندامت میں ڈوبا ہوا تھا۔ چونکا۔ "کون"

"وہی، ملاب"

"کیوں ۔۔ ؟"

بھینا دے کے لہجہ میں عجیب و غریب احتجاج تھا ہم اس کو اتنا وقت چوتے رہے جب بولا کہ آؤ۔ تو سالی کہنے لگی ــــــ تم ہمارا بھائی ہے ہم نے کسی سے شادی کر لی ہے۔" اور باہر نکل گئی ــــــ کہ وہ سالا گھر میں آگیا ہوگا۔

*

چودھویں کا چاند

اکثر لوگوں کا طرزِ زندگی ان کے حالات پر منحصر ہوتا ہے اور بعض بیکار اپنی تقدیر کا روز رونا روتے رہتے ہیں حالانکہ اس سے حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں اگر حالات بہتر ہوتے تو وہ ضرور دنیا میں کچھ کر دکھاتے۔ بیشتر ایسے بھی ہیں جو مجبوریوں کے باعث قسمت پر شاکر رہتے ہیں ان کی زندگی ان ٹرام کاروں کی طرح ہے جو ہمیشہ ایک ہی پٹڑی پر چلتی رہتی ہیں جب کنڈم ہو جاتی ہیں تو انہیں محض لوہا سمجھ کر کسی کباڑی کے پاس فروخت کر دیا جاتا ہے۔

ایسے انسان بہت کم ہیں جنہوں نے حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔ تامس ولسن بھی اسی قبیل سے تھا۔

اس نے اپنی زندگی بدلنے کے لئے انوکھا قدم اٹھایا۔ پر اس کی منزل کا چونکہ کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس لئے اس کی کامیابی کے بارے میں اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔

اس کے اس انوکھے پن کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا سب سے پہلے لوگ یہی کہتے کہ وہ بہت خلوت پسند ہے۔ لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی حیلے اسے اپنی داستان زندگی بیان کرنے پر آمادہ کر لوں گا۔ کیونکہ مجھے دوسرے آدمیوں کے اطمینان کی صداقت پر یقین نہیں تھا۔

میں چند روز کے لئے ایک صحت افزا مقام پر گیا وہیں اس سے ملاقات ہوئی ـــــ میں دریا کنارے اپنے میزبان کے ساتھ کھڑا تھا کہ وہ ایک دم پکار اٹھا۔ "ولسن ہے"

"میں نے پوچھا۔ کہاں ہے۔؟"

میرے میزبان نے جواب دیا ـــــ ارے بھئی۔ وہی جو منڈیر پر نیلی قمیض پہنے ہماری طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہے۔"

میں نے اس طرف دیکھا ـــــ اور مجھے نیلی قمیض اور سفید بالوں والا سر نظر آیا ـــــ میری بڑی خواہش تھی کہ وہ مڑ کر دیکھے اور ہم اسے سیر و تفریح کے لئے ساتھ لے جائیں۔

اس وقت سورج کا عکس دریا میں ڈوب رہا تھا سیر کرنے والے چھپ چکے تھے اتنے میں گرجا کی ایک آہنگ گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں اس وقت قدرت کی دل فریبیوں سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ ولسن کو اپنی طرف آتے نہ دیکھ سکا۔

جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میرے دوست نے اسے روک لیا اور اس کا مجھ سے تعارف کرایا اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن کسی قدر بے اعتنائی سے ـــــ میرے دوست نے اس کو محسوس کیا اور اس کو شراب کی دعوت دی۔

وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگرچہ اس کے دانت خوبصورت نہ تھے پھر بھی اس کی مسکراہٹ دلکش تھی ـــــ وہ نیلی قمیض اور خاکستری پتلون پہنے تھا! جو کسی حد تک میلی تھی۔ اس کے لباس کو اس کے جسم کی ساخت سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔

اس کا چہرہ لمبوترا پتلے ہونٹ اور آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں چہرے کے خطوط نمایاں۔ جن سے نمایاں تھا کہ جوانی میں وہ ضرور قبول صورت ہو گا! وضع قطع کے اعتبار سے وہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

ہم چہل قدمی کرتے ایک ریستوران میں پہنچ کر اس کے ملحقہ باغیچے میں بیٹھ گئے اور بیرے کو شراب لانے کے لئے کہا ـــــ ہوٹل والے کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ ادھیڑ پن کی وجہ سے اب اس میں وہ بات نہیں رہی تھی لیکن چہرے کا نکھار اب بھی گزری ہوئی گرما گرم جوانی کی چغلیاں کھا رہا تھا تیس سال پہلے بڑے بڑے آرٹسٹ اس کے دیوانے تھے اس کی بڑی بڑی شرابی آنکھوں اور شہد بھری مسکراہٹوں میں عجب دلکشی تھی۔

ہم تینوں بیٹھے یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چونکہ موضوع دلچسپ نہیں تھے۔ اس لئے ولسن تھوڑی دیر کے بعد رخصت مانگ کر چلا گیا ہم بھی اس کے رخصت ہونے پر اداس ہو گئے۔

واستے میں میرے دوست نے ولسن کے بارے میں کہا۔ "مجھے تو تمہاری سنائی ہوئی کہانی بے سروپا معلوم ہوتی ہے۔"

"کیوں۔؟"

"وہ اس قسم کی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

اس نے کہا۔ "کوئی شخص کسی کی فطرت کے متعلق صحیح اندازہ کیسے لگا سکتا ہے۔"

"مجھے تو وہ عام انسان دکھائی دیتا ہے جو چند محفوظ کفالتوں کے سہارے کاروبار سے علیحدہ ہو چکا ہے۔"

"تم یہی سمجھو ——— ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن دریا کے کنارے ولسن ہمیں پھر دکھائی دیا ——— بھورے رنگ کا لباس پہنے، دانتوں میں پائپ دبائے کھڑا تھا۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کی جھریوں اور سفید بالوں سے بھی جوانی پھوٹ رہی ہے۔

ہم کپڑے اتار کر پانی کے اندر چلے گئے۔

جب میں نہا کر باہر نکلا تو ولسن زمین پر اوندھے منہ لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا ——— میں سگریٹ سلگا کر اس کے پاس گیا۔

اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"بس نہا چکے۔"

میں نے جواب دیا ——— ہاں۔ آج تو لطف آگیا دنیا میں اس سے بہتر نہانے

کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی ——— تم یہاں کتنی مدت سے ہو۔؟"

اس نے جواب دیا۔ "پندرہ برس سے"

یہ کہہ کر وہ دریا کی مچلتی ہوئی نیلی لہروں کی طرف دیکھنے لگا اس کے باریک ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی ——— پہلی بار یہاں آتے ہی مجھے اس جگہ سے محبت ہو گئی ——— تمہیں اس جرمن کا قصہ معلوم ہے جو ایک بار یہاں لنچ کھانے آیا اور یہیں کا ہو کے رہ گیا۔ وہ چالیس سال یہاں رہا۔ میرا بھی یہی حال ہو گا ——— چالیس برس نہیں تو پچیس تو کہیں نہیں گئے۔

"میں جانتا تھا۔ کہ وہ اپنی گفتگو جاری رکھے اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس کے افسانے کی حقیقت ضرور کچھ ہے۔

اتنے میں میرا دوست بھیگا ہوا ہماری طرف آیا ——— بہت خوش تھا کیونکہ وہ دریا میں ایک میل تیر کر آیا تھا ——— اس کے آتے ہی ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اور بات ادھوری رہ گئی۔

اس کے بعد ولسن سے متعدد بار ملاقات ہوئی اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں وہ اس جزیرے کے چپے چپے سے واقف تھا

ایک دن چاندنی رات کا لطف اٹھانے کے بعد میں نے اور میرے دوست نے سوچا۔ کہ چلو مونٹی سلادر کی پہاڑی کی سیر کریں میں نے ولسن سے کہا "آؤ یار تم بھی ہمارے ساتھ چلو"

ولسن نے میری دعوت قبول کر لی لیکن میرا دوست ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے

ہم سے جدا ہوگیا۔ خیر ہم دونوں پہاڑی کی جانب چل دیئے۔ اور اس سیر کا خوب لطف اٹھایا۔ شام کے دھندلکے میں تھکے ماندے بھوکے۔ سرائے میں آئے۔

کھانے کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا جو بہت لذیذ ثابت ہوا شراب انگور کی تھی پہلی بوتل تو ستوپاں کھانے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی دوسری جام کے آخری جام پینے کے بعد میرے اور ولسن کے دماغ پر بیک وقت یہ خیال سمانے لگا کہ زندگی کچھ ایسی دشوار نہیں۔

ہم اس وقت باغیچے میں انگوروں سے لدی ہوئی بیل کے نیچے بیٹھے تھے رات کی خاموش فضا میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سرائے کی خادمہ ہمارے لئے پنیر اور انجیریں لے آئی۔

ولسن تھوڑے سے وقفے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا

"ہمارے چلنے میں ابھی کافی دیر ہے چاند کم از کم ایک گھنٹے تک پہاڑی کے اوپر آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس فرصت ہی فرصت ہے ——— یہاں آکر کوئی انسان بھی عجلت کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔"

ولسن مسکرایا ——— "فرصت ——— کاش لوگ اس سے واقف ہوتے ہر انسان کو یہ چیز مفت میسر ہو سکتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ——— کام۔ کمبخت اتنا سمجھنے کے بھی اہل نہیں کہ کام کرنے سے غرض صرف فرصت حاصل کرنا

ہے ——— "

شراب کا اثر عموماً بعض لوگوں کو غور و فکر کی طرف لے جاتا ہے ولسن کا خیال اپنی جگہ درست تھا ——— مگر کوئی اچھوتی اور انوکھی بات نہیں تھی اس نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا۔

جب میں پہلی بار یہاں آیا تو چاندنی رات کا سماں تھا۔ آج بھی وہی چودھویں کا چاند آسمان پر نظر آئے گا۔

میں مسکرا دیا۔ "ضرور نظر آئے گا"

وہ بولا ——— دوست میرا مذاق نہ اڑاؤ ——— جب میں اپنی زندگی کے پچھلے پندرہ برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ طویل عرصہ ایک مہینے کا دھندلا دھندلا وقفہ سا لگتا ہے

آہ وہ رات، جب پہلی بار میں نے چبوترے پر بیٹھ کر چاند کا نظارہ کیا ——— کرنیں دریا کی سطح پر چاندی کے پترے چڑھا رہی تھیں میں نے اس وقت شراب ضرور پی رکھی تھی لیکن دریا کے کنارے اور اس پاس کی فضا نے جو نشہ پیدا کیا وہ شراب کبھی پیدا نہ کر سکتی۔

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے۔" اس نے اپنا گلاس اٹھایا ——— مگر وہ خالی تھا۔ ایک بوتل منگوائی گئی ———!

ولسن نے دو چار بڑے بڑے گھونٹ پیئے اور کہنے لگا۔ اگلے دن میں دریا کے کنارے نہایا اور جزیرے میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ بڑی رونق تھی۔ معلوم ہوا

کہ حسن و عشق کی دیوی افروڈائٹ کا تہوار ہے۔ اگر میری تقدیر میں سڈبینک کا منتظم ہونا ہی لکھا ہوتا تو یقیناً مجھے ایسی سیر کبھی نصیب نہ ہوتی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم کسی بینک کے منیجر ہو؟"

"ہاں بھائی تھا۔ وہ رات میرے قیام کی آخری رات تھی کیونکہ پیر کی صبح کو مجھے بینک میں حاضر ہونا تھا پر جب میں نے چاند دریا اور کشتیوں کو دیکھا۔ تو ایسا بے خود ہوا کہ واپس جانے کا خیال میرے ذہن سے اتر گیا"

اس کے بعد اس نے اپنے گذشتہ واقعات تفصیل سے بتلائے اور کہا۔ کہ وہ جزیرے میں پندرہ سال سے مقیم ہے۔ اور اب اس کی عمر انچاس برس کی تھی۔!

پہلی بار جب وہ یہاں آیا تو اس نے سوچا کہ ملازمت کا طوق مجھے گلے سے اتار دینا چاہیئے اور زندگی کے باقی ایام یہاں کی مسحور کن فضاؤں میں گزارنے چاہیئں۔

جزیرے کی فضا اور چاند کی روشنی ولسن کے دماغ پر اس قدر غالب آئی کہ اس نے بینک کی ملازمت ترک کر دی اگر وہ چند برس اور وہاں رہتا تو اسے معقول پنشن مل جاتی مگر اس نے اسکی مطلق پرواہ نہ کی۔ البتہ بینک والوں نے اسے اس کی خدمات کے عوض انعام دیا۔ ولسن نے اپنا گھر بیچا اور جزیرے کا رخ کیا۔ اس کے اپنے حساب کے مطابق وہ سو پچیس برس تک اپنی زندگی بسر کر سکتا تھا۔

میری اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا اعتدال پسند ہے۔ اسے کوئی ایسی بات گوارہ نہیں جو اس کی آزادی میں خلل ڈالے اسی وجہ سے عورت بھی اس کو متاثر نہ کر سکی وہ صرف قدرتی مناظر کا پرستار تھا اس کی زندگی کا واحد مقصد صرف اپنے لئے خوشی تلاش کرنا تھا۔ اور اسے یہ نایاب چیز مل گئی تھی۔

بہت کم انسان خوشی کی تلاش کرنا جانتے ہیں میں نہیں کہہ سکتا وہ سمجھدار تھا۔ یا بے وقوف اتنا ضرور ہے کہ اپنی ذات کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔

آخری ملاقات کے بعد میں نے اپنے میزبان دوست کے لئے رخصت چاہی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں جنگ چھڑ گئی۔ اور میں تیرہ برس تک اس جزیرے پر نہ جا سکا۔

تیرہ برس کے بعد جب میں جزیرے پر پہنچا تو میرے دوست کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی میں نے ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا کھانے پر اپنے دوست سے ولسن کے متعلق بات ہوئی۔

وہ خاموش رہا۔۔۔ اس کی یہ خاموشی بڑی افسردہ تھی میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔۔۔ "کہیں اس نے خودکشی تو نہیں کر لی؟"

میرے دوست نے آہ بھری۔۔۔ یہ درد بھری داستان میں تمہیں کیا سناؤں۔ ولسن کی اسکیم معقول تھی کہ وہ پچیس برس آرام سے گزار سکتا ہے

پر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آرام کے پچیس برس گزارنے کے ساتھ ہی اس کی قوتِ ارادی ختم ہو جائے گی۔

قوتِ ارادی کو زندہ رکھنے کے لیے کشمکش ضروری ہے ہموار زمین پر چلنے والے پہاڑیوں پر نہیں چڑھ سکتے۔ اس کا روپیہ ختم ہو گیا۔ ادھار لیتا رہا لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا قرض خواہوں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا آخر ایک روز اس نے اپنی جھونپڑی کے اس کمرے میں جہاں وہ سوتا تھا بہت سے کوئلے جلائے اور دروازہ بند کر دیا۔

صبح جب اس کی نوکرانی ناشتہ تیار کرنے آئی تو اسے بیہوش پایا۔ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ بچ گیا۔ پر اس کا دماغ قریب قریب ماؤف ہو گیا۔ میں اس سے ملنے گیا لیکن وہ کچھ اس طرح حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے مجھے پہچان نہیں سکا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "اب کہاں رہتا ہے"

"گھر بار تو اس کا نیلام ہو گیا ہے — پہاڑیوں پر آوارہ پھرتا رہتا ہے میں نے ایک دو مرتبہ اسے پکارا مگر وہ میری شکل دیکھتے ہی جنگلی ہرن کی طرح تلابخیش بھرتا دوڑ گیا۔

دو تین دن کے بعد جب میں اور میرا دوست چہل قدمی کر رہے تھے کہ میرا دوست زور سے پکارا۔ "ولسن"

میری نگاہوں نے اسے زیتون کے درخت کے پیچھے چھپتے دیکھا ہمارے قریب پہنچنے پر اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ بس ساکت و صامت کھڑا رہا پھر ایکا ایکی حیوانوں کی مانند بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے پھر اس کو کبھی نہ دیکھا۔

گھر واپس آیا تو ایک برس کے بعد میرے دوست کا خط آیا۔ کہ ولسن مر گیا ہے اس کی لاش پہاڑی کے کنارے پڑی تھی۔ چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سوتے میں دم نکل گیا ہے — اس رات چودھویں کا چاند تھا میرا خیال ہے شائد یہ چودھویں کا چاند ہی اس کی موت کا سبب ہو۔

بادہ شمالی

دو گوگلز آئیں۔ تین لش شرٹوں نے ان کا استقبال کیا۔ بش شرٹیں دنیا کے نقشے بنی ہوئی تھیں ان پر پرندے، چرندے، درندے، پھول بوٹے اور کئی ملکوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔

دونوں گوگلز نے اپنی کتابیں میز پر رکھیں اپنے ڈسٹ کوٹ اتارے اور لش شرٹوں کے بٹن بن گئیں۔

ایک گوگل نے اس بش شرٹ سے جو خالص امریکی تھی۔ کہا۔

"آپ کا باس بڑا واہیات ہے۔"

"وہ لش شرٹ ہنسا ——۔ تمہارے گوگلز بڑے واہیات ہیں اسے لگا کر تم ایسے دکھائی دیتی ہو جیسے روشن دن اندھیری رات بن گیا ہے۔"

اس اندھیری رات نے لش شرٹ سے کہا۔ "میں تو چاندنی رات ہوں"

امریکی لش شرٹ نے اسکو ایک کرہ ہمالہ پیش کیا جو بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

اس نے چمچ سے اس کرہ ہمالہ کو سر کر لیا لیکن اس مہم کے دوران میں اسکو بڑی کوفت ہوئی۔ وہ برفوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اپنی سہیلی دوسری گوگلز کے ساتھ آگئی تھی کہ وہاں اس کا پہناوا بش شرٹ مل گیا۔

دوسری گوگلز اپنے لش شرٹ سے علیحدہ باتیں کر رہی تھی۔

"آج تم اتنی حسین کیوں دکھائی دے رہی ہو۔؟"

"مجھے کیا معلوم ——"

"اپنی چقیں اتار دو۔"

"کیوں۔؟"

"مجھے تمہاری آنکھیں نظر نہیں آتیں۔"

"میرا دل تو تمہیں نظر آ رہا ہوگا۔"

"نظر آتا رہا ہے۔ نظر آتا رہے گا —— لیکن مجھے تمہاری آنکھوں کے یہ غلاف پسند نہیں۔"

"تیز روشنی مجھے پسند نہیں نا۔"

"کیوں۔؟"

"بس نہیں —— تمہاری بش شرٹ بھی مجھے پسند نہیں۔"

"کیوں ——؟"

"اسلئے کہ اس کا ڈیزائن بہت بے ہودہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئس کریم میں کیڑے مکوڑے چل رہے ہوں ——"

"تم کھا تو چکی ہو۔"

"میں نے تو صرف چکھی ہے کھائی کب ہے۔"

"آپ باردہ شمالی میں صرف آئس کریم چکھنے کے لئے ہی آتی ہیں۔"

"آپ مجبور کرتے ہیں تو میں آ جاتی ہوں۔ ورنہ مجھے ایسی جگہ سے کوئی رغبت تھی۔"

"میں یہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر کوئی مہم سر کریں۔"

"کون سی مہم۔؟"

"بیشمار مہمیں ہیں۔ لیکن ایک سب سے بڑی ہے۔"

"کون سی۔؟"

"کسی آتش فشاں پہاڑ کے اندر کود جائیں اور وہاں کے حالات معلوم کریں۔"

"میں تیار ہوں۔ لیکن پھر میں یہاں آ کر آئس کریم ضرور کھاؤں گی۔"

"میں کھلاؤں گا نہیں۔"

دونوں باہوں میں باہیں ڈالے ایک ایسی دوزخ میں چلے گئے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس گوگر کی ساری کتابیں اس بش شرٹ کی لائبریری میں داخل ہو گئیں۔

دوسری گرگر نے اپنی بش شرٹ کو اپنے بلاوز کی ساری کتابیں پڑھا دیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بش شرٹ کسی گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی ہے۔

اس نے باردہ شمالی میں اس سے کہا تھا "تم آئس کریم نہ کھایا کرو۔ ہم

آئندہ آتشیں ہاؤس جایا کریں گے۔"

دوسری گرگر کلبلانے لگی اس نے اپنی بش شرٹ کے کالر بنانا شروع کر دیئے اور ان میں کئی پھول ٹانک دیئے۔ یہ بش شرٹ گھٹیا قسم کے درزی کی سلی ہوئی نہیں تھی اصل میں اس کا کپڑا کھردرا تھا جیسے ٹاٹ ہو اس لئے دوسری گرگر نے اپنی مخمل کے کئی پیوند لگائے مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ وہ آتشیں ہاؤس میں بھی کئی مرتبہ گئے تھے وہاں انہوں نے کئی گلاس پگھلی ہوئی آگ کے پیئے مگر کوئی تسکین نہ ہوئی۔

دوسری گرگر حیران تھی کہ اس کا بش شرٹ جس کے لئے اس نے اپنے بلاوز کے تمام بخیئے ادھیڑ دیئے اس سے ملتفت کیوں نہیں ہوتا وہ اس کی ہر سلوٹ سے پیار کرتی تھی لیکن وہ باردہ شمالی میں نہ آتشیں ہاؤس میں ایک خوبصورت فیرم سے کوئی دلچسپی لیتا ہی نہیں تھا۔

عجیب بات ہے کہ وہ باردہ شمالی میں گرم ہو جاتا اور آتشیں ہاؤس میں اولا سا بن جاتا دوسری بش شرٹ بہت حیران تھی۔ کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے پہلی گوگر کو جو اس کی ہمسی تھی۔ ایک خط لکھا اور اس کو اپنا سارا دکھ سنایا۔

اس نے جواب میں یہ لکھا۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ بش شرٹ ایسے ہی ہوتے ہیں کبھی سکڑ جاتے ہیں کبھی پھیل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری لانڈری میں بھی کوئی نقص ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرو تمہاری استری بھی ایسا معلوم ہوتا ہے خراب ہو گئی ہے اسے ٹھیک کراؤ کہیں کرنٹ تو نہیں مارتی۔ دوسری گرگر نے اسے لکھا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری استری کرنٹ مارتی ہے میرا بش شرٹ گیلا ہو چکا ہوتا ہے۔ کہ میری

استری گرم ہوتی ہے میں جب اس پر پھیرتی ہوں تو مجھے بجلی کے دھکے لگتے ہیں۔

جواب میں اس کی سہیلی نے لکھا — میں تمہاری استری کی خرابی سمجھ گئی ہوں نیا پلگ بھیج رہی ہوں اس کو لگا کر دیکھو شاید یہ خرابی دور ہو جائے۔

وہ پلگ آیا۔ بڑا خوبصورت تھا مگر جب اس نے اپنی استری میں لگانا چاہا تو فٹ نہ ہوا کنڈم کر کے اس نے واپس کر دیا اور اپنے بش شرٹ کی رفوگری شروع کر دی۔

یہ کام بڑا نازک تھا مگر اس دوسری گوگلز نے بڑی محنت سے کیا پر نتیجہ پھر بھی صفر رہا۔ وہ بارہ دہ شمالی میں گئی — وہاں اس کے پانچ کوہ پیما ہجولیوں سے سیر کیے۔ وہاں سے رنج لستہ ہو کے اٹھی اور ایک نہایت واہیات بش شرٹ کے ساتھ آتشیں ہاؤس جا کر اس نے دس جولا مکھی نکلے اور واپس اپنے جھونپڑے کے جھیلے میں آگئی۔

دوسرے دن وہ پھر اپنے چہیتے بش شرٹ سے ملی اس کو اس نے بتایا کہ وہ ایک رات ایک نہایت فضول قسم کے بش شرٹ کے ساتھ آتشیں ہاؤس گئی تھی اس نے قطعی برا نہ مانا تو وہ سوچنے لگی کہ وہ کیسا کلف لگا بش شرٹ ہے جس کی جیبوں میں رشک اور حسد کے سکے کھنکھناتے ہی نہیں۔

اس نے پھر اپنی سہیلی گوگلز کو خط لکھا اور سنایا۔ "تمہارا بھیجا ہوا پلگ میری استری میں لگا ہی نہیں — میں نے واپس بھیج دیا تھا امید ہے کہ تمہیں مل گیا ہوگا۔ اب مجھے تم سے یہ پوچھنا ہے کہ میں کیا کروں وہ میرا بش شرٹ سمجھ میں نہیں

آتا کیا شے ہے۔ خدا کے لئے اکڑ میں بہت پریشان ہوں اپنے بش شرٹ کو میرا سلام کہنا میرا خیال ہے کہ تم اسے ہر بات بتتی ہوگی — اس کا کپڑا بڑا ملائم ہے۔

اس کی سہیلی اسکے بلاوے پر آگئی اس کے ساتھ اس کا اپنا بش شرٹ بھی تھا۔ دونوں بہت خوش تھیں ان کے شیشے آپس میں ٹکرائے تو بڑی کھنکھنیں پیدا ہوئیں جیسے کئی کانچ کی چوڑیاں ایک کلائی میں بج رہی ہوں۔

اس کی سہیلی گوگلز کا فریم سنہرا تھا۔ اسے دیکھ کر دوسری کو تھوڑا سا رشک ہوا مگر اس نے اس جذبے کو فوراً دور کر دیا اور اس سنہرے فریم کا تعارف اپنے بش شرٹ سے کرایا تاکہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرے اور بتلائے کہ اس پر استری کس طرح کرنی چاہیئے تاکہ اس کی سلوٹیں دور ہو جائیں۔

وہ اپنی سہیلی کے بش شرٹ سے بڑے تپاک سے ملی۔ اس نے بڑے غور سے اس کا ٹانکہ ٹانکہ دیکھا مگر اسے کوئی عیب نظر نہ آیا وہ اس کے اپنے بش شرٹ کے مقابلے میں کئی درجے اچھا سلا ہوا تھا۔

ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں آخر ایک دن انہوں نے بارہ دہ شمالی جانے کا پروگرام بنایا وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس بش شرٹ کا ردعمل کیا ہوتا ہے وہ اپنی سہیلی گوگلز سے کہہ گئی تھی۔ کہ وہ اپنے شیشوں میں سے اس کے بش شرٹ کو دیکھنا چاہتی ہے۔

جب وہ بارہ دہ شمالی میں گئے۔ تو وہاں اس بش شرٹ کو آگ لگ گئی جس میں اس نے اپنے ساتھی گوگلز کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ دونوں دیر تک اس آگ میں جلتے رہے

اور اسے بجھانے کے لئے آتشیں ہاؤس میں چلے گئے۔ چونکہ آپ کے زیادہ پڑ گئے تھے اسلئے وہ کئی دن ان کا علاج باہر ہی باہر کرتے رہے۔

دوسری گوگز حیران تھی کہ یہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ ایک دونوں شیشے دھندلے ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک اسکی سہیلی کا لش شرٹ آگیا۔ اس نے اس کو پہچانا اور کہا۔ "معاف کیجئے گا میرے شیشے دھندلے ہو گئے ہیں۔"

اس نے فوراً اس کے شیشے نکالے اور ان کو اپنی سانسوں سے پہلے گرم پھر نم آلود کیا۔ اور اپنے دامن سے پونچھ کر صاف کر دیا۔

وہ حیرت زدہ ہو گئی۔۔۔ اس کی زندگی میں اس کے شیشے کبھی اتنے صاف نہیں ہوئے تھے۔ دونوں بادِ شمالی میں کوہ ہمالہ کھانے کے لئے گئے۔ وہ ابھی کھا ہی رہے تھے کہ پہلا بش شرٹ دوسری گوگز کے ساتھ آگیا۔

دونوں خاموش رہے۔۔۔ انہوں نے دل ہی دل میں محسوس کر لیا۔ کہ وہ غلط چوٹیوں پر چڑھ رہے تھے۔

قرض کی پیتے تھے۔۔۔۔

ایک جگہ محفل جمی تھی۔ مرزا غالب وہاں سے اکتا کر اٹھے باہر ہوادار موجود تھا اس میں بیٹھے اور اپنے گھر کا رخ کیا ہوادار سے اتر کر جب دیوان خانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ متھرا داس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ "اخاہ متھرا داس۔۔۔ بھئی تم آج بڑے وقت پر آئے۔ میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔"

متھرا داس نے ٹھیٹ مہاجنوں کے سے انداز میں کہا۔ "حضور روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقد دو قسط آپ نے بھجوائے تھے۔۔۔ اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے ایک پیسہ بھی آپ نے نہ دیا۔"

اسد اللہ خان غالب مسکرائے۔ "بھئی متھرا داس دینے کو میں سب دے دوں گا گلے گلے پانی دوں گا۔ دو ایک جائیداد میری باقی ہے۔"

"اجی سرکار۔۔۔ اس طرح بیوپار ہو چکا۔۔۔ نہ اصل میں سے نہ سود میں سے پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نہیں ہوا۔ چھ سو چھبیس سود کے ہو گئے۔"

مرزا غالب نے حقے کی نے پکڑ کر ایک کش لیا — لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں پانی دو تو اناج پیدا ہو۔

متھرا داس نے اپنی دھوتی کی لانگ کھٹک کی — جی دیوالی کو بارہ رت باقی رہ گئے ہیں کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر دستاویز بنا دیں تو آگے کا نام لیں۔

مرزا غالب نے حقے کی نے ایک طرف کی۔ "لو ابھی دستاویز لکھے دیتا ہوں شرط یہ ہے کہ دو ہزار ابھی ابھی مجھے اور دو۔"

متھرا داس نے تھوڑی دیر غور کیا — اچھا۔ میں اسٹام منگواتا ہوں یہی ساتھ لایا ہوں — آپ منشی غلام رسول عرضی نویس کو بلا لیں۔ پر سود وہی سوا روپیہ سیکڑہ ہوگا۔"

"لالہ کچھ تو انصاف کرو۔ بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں —"

متھرا داس نے اپنی دھوتی کی لانگ دوسری بار درست کی۔ "سرکار بارہ آنے پر بارہ برس بھی کوئی مہاجن قرض نہیں دے گا۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔"

ان دنوں واقعی بہادر شاہ ظفر کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو اپنے اخراجات کے لئے روپے پیسے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔

بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھا لیکن مرزا غالب شاعر تھے وہ اپنے شعروں میں اپنا

رشتہ سپاہ گری سے جوڑتے تھے۔

یہ مرزا صاحب کے چالیسویں پینتالیسویں سال کی درمیانی عرصے کی بات ہے جب متھرا داس مہاجن نے ان پر عدم ادائیگی قرضہ کے باعث دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کیا مقدمے کی سماعت مرزا صاحب کے مربی اور دوست مفتی صدر الدین آزردہ کو کرنا تھی جو خود بہت اچھے شاعر اور غالب کے مداح تھے۔

مفتی صاحب کے پردھانے عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر آواز دی لالہ متھرا داس مہاجن اور مرزا اسد اللہ خان غالب مدعا علیہ حاضر ہیں۔

متھرا داس نے مرزا غالب کی طرف دیکھا اور مردھے نے کہا۔ "ابھی دونوں حاضر ہیں"

مردھے نے رعونت سے کہا۔ "تو دونوں حاضر عدالت ہوں۔"

مرزا غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر مفتی صدر الدین آزردہ کو سلام کیا مفتی صاحب مسکرائے۔

"مرزا نوشہ یہ آپ اس قدر قرض کیوں لیا کرتے ہیں آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

غالب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "کیا عرض کروں۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔"

مفتی صدر الدین مسکرائے۔ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"

غالب نے برجستہ کہا۔ ایک شعر موزوں ہو گیا ہے مفتی صاحب حکم ہو تو جواب میں عرض کروں۔"

"فرمائیے۔"

سزا دیجئے گر آپ صدر الصدور ہیں۔"

"دیکھو تم ایسی باتیں مت کرو۔"

"تو اور کیسی باتیں کروں"

"کوئی شعر سنائیے۔"

"سوچتا ہوں — ہاں ایک شعر رات کو ہو گیا تھا عرض کئے دیتا ہوں"

"فرمائیے۔"

ہم اور وہ سبب رنج آشنا دشمن

مفتی صاحب نے اپنے قانونی قلم سے قانونی کاغذ پر بہ حروف لکھے

'ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن' کہ رکھتا ہے

مفتی صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ یہ شعر آسانی سے سمجھ میں آ سکنے والا نہیں لیکن وہ چونکہ خود بہت بڑے شاعر تھے۔ اس لئے غالب کی دقیقہ بیانی کو فوراً سمجھ گئے۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت ہوئی مفتی صدر الدین آزردہ نے مرزا غالب سے کہا

"آپ آئندہ قرض کی مے نہ پیا کریں۔"

غالب جو شاید کسی شعر کی فکر کر رہے تھے۔ کہا۔ ایک شعر ہو گیا اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔"

مفتی صاحب نے کہا۔ "فرمائیے — فرمائیے۔"

مرزا غالب کچھ دیر خاموش رہے۔ غالباً ان کو اس بات سے بہت کوفت ہوئی

غالب نے مفتی صاحب اور متھرا داس مہاجن کو ایک لحظہ کے لئے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

مفتی صاحب بے اختیار ہنس پڑے "خوب خوب — کیوں صاحب رسی جل گئی پر بل نہ گیا آپ کے اس شعر کی میں تو ضرور داد دوں گا۔ مگر چونکہ مدعی کا اصل اور سود سب ثبت ہے اقرار ہے عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مرزا غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مدعی بجا ہے تو کیوں فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو اور میں نے بھی سچی بات نثر میں نہ کہی، نظم میں کہہ دی۔"

مفتی صدر الدین آزردہ نے کاغذات قانون ایک طرف رکھے اور مرزا غالب سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا تو زر ڈگری میں ادا کر دوں گا۔ کہ ہماری آپ کی دوستی کی لاج رہ جائے۔"

مرزا غالب بڑے خود دار تھے انہوں نے مفتی صاحب سے کہا۔ "حضور ایسا نہیں ہو گا — مجھے متھرا داس کا روپیہ دینا ہے — میں بہت جلد ادا کر دوں گا۔" مفتی صاحب مسکرائے۔ "حضرت روپیہ کی ادائیگی شاعری نہیں آپ تکلف کو برطرف رکھئے۔ میں آپ کا مداح ہوں مجھے آج موقع دیجئے کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔"

غالب خفیف ہوئے۔ "لاحول ولا — آپ میرے بزرگ ہیں — مجھے کوئی

تھی۔ کہ مفتی صاحب ان پر ایک احسان کر رہے ہیں۔"

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا۔ "حضرت آپ خاموش کیوں ہو گئے۔"

"جی کوئی خاص بات نہیں ۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی!

"آپکو باتیں کرنا تو ماشاء اللہ آتی ہیں۔"

غالب نے جواب دیا۔ جی ہاں ——— لیکن بنانا نہیں آتیں۔"

مفتی صدر الدین مسکرائے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ زر ڈگری میں ادا کر دوں گا۔"

مرزا غالب نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا ——— "کہ آپ نے دوستی کے تمسک پر مہر لگا دی جب تک زندہ ہوں ——— بندہ ہوں۔"

مفتی صدر الدین آزردہ نے ان سے کہا "اب آپ تشریف لیجائیے پر خیال رہے کہ روز روز زر ڈگری میں ادا نہیں کر سکتا آئندہ احتیاط رہے۔"

مرزا غالب تھوڑی دیر کے سوچ میں غرق ہو گئے۔

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا ——— "کیا سوچ رہے ہیں آپ۔؟"

مرزا غالب چونک کر بولے ——— "جی میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ شاید کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

کرشن

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا ——— کیا آپکو رات بھر نیند نہیں آتی۔"

مرزا غالب نے مسکرا کر کہا۔ "کسی خوش نصیب کو ہی آتی ہوگی۔"

مفتی صاحب نے کہا۔ آپ شاعری چھوڑ دیجئے ——— بس آئندہ احتیاط رہے۔"

مرزا صاحب اپنے انگرکھے کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولے آپکی نصیحت پر چل کر ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کروں گا۔ مفتی صاحب مفت کی رحمت آپکو ہوتی نقد اُدھار شکریہ اور کیا ادا کر سکتا ہوں خیر خدا آپکو دس گنا دنیا میں ستر گنا آخرت میں دیگا۔

یہ سن کر مفتی صدر الدین آزردہ لب مسکرائے۔ "آخرت والے میں تو آپکو شریک کرنا محال ہے۔ دنیا کے دس گنے میں بھی آپ کو ایک کوڑی نہیں دوں گا ——— کہ آپ مے خواری کیجئے۔

مرزا غالب ہنسے ——— میخواری کیسی مفتی صاحب ـــ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اور یہ شعر سنا کر مرزا غالب عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

پُراسرار زینا

(شاہدہ)

شاہدہ جو کہ محسن عبداللہ کی فرمانبردار بیوی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی اسلئے کہ علیگڑھ میں میاں بیوی کی محبت ہوئی تھی - اور یہ محبت ان دونوں کے دلوں میں ایک عرصہ تک برقرار رہی۔

شاہدہ اس قسم کی لڑکی تھی جو اپنے خاوند کے سوا اور کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی لیکن محسن عبداللہ ایسا نوجوان تھا جو مختلف میوے چکھنے کا عادی تھا۔ شاہدہ کو اسکی اس عادت کا علم نہیں تھا ویسے وہ جانتی تھی کہ اسکے خاوند کی بہنیں بڑی آزاد خیال ہیں مردوں سے بڑی بے باکی سے ملتی ہیں ان سے جنسیات کے بارے میں گفتگو کرنے سے بھی نہیں چوکتیں مگر اسے ان کے یہ انداز پسند نہ تھے۔

محسن کی ایک بہن (ڈاکٹر رشید جہاں) نے تو ایسے پر پرزے نکالے تھے کہ حد ہی کر دی تھی۔ میں ان دنوں ایم او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ اسمیں ایک نئے پروفیسر صاحبزادہ محمود الظفر آئے - یہ ڈاکٹر رشید جہاں کے خاوند تھے۔

میں بہت پیچھے چلا گیا ہوں لیکن واقعات کیونکہ اچانک میرے دماغ میں آ رہے ہیں اسلئے میں مجبور ہوں کہ اس مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکے گا بہرحال آپ پڑھیں گے تو آپ کڑیاں ملا سکیں گے۔

بہر حال صاحبزادہ محمود الظفر بڑے خوش شکل نوجوان تھے ان کے خیالات اشتراکی تھے اس کالج میں فیض احمد فیض صاحب جو بڑے اپنی قسم کے آدمی تھے پڑھایا کرتے تھے ان سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔

ایک ہفتہ کی شام کو انہوں نے مجھ سے کہا۔ کہ وہ ڈیرہ دون جا رہے ہیں چند چیزیں انہوں نے مجھے بتائیں کہ میں خرید کرکے آؤں میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اس کے بعد ہر ہفتے ان کے حکم کی تعمیل کرنا میرا معمول ہو گیا۔

وہ دراصل ڈیرہ دون میں ڈاکٹر رشید جہاں سے ملنے جاتے تھے ان سے غالباً ان کو عشق کی قسم کا لگاؤ تھا۔

معلوم نہیں اس لگاؤ کا کیا حشر ہوا۔ مگر فیض صاحب نے اُن دنوں اپنی اینگی کے باوجود بڑی خوبصورت غزلیں لکھیں۔

یہ تمام ضمنی مناظر ہیں ـــــ محسن عبداللہ کو کسی وساطت سے بمبئی ٹاکیز میں ملازمت مل گئی ان دنوں یہ فلمی ادارہ بڑا وقار رکھتا تھا اسکے روح رواں ہمانسو رائے تھے۔ وہ تنظیم اور اچھی فضا کے بہت قائل تھے ان کی یہی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے اسٹوڈیو میں جگہ دیں۔

محسن عبداللہ کو لیبارٹری میں جگہ مل گئی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے احکام

کے مطابق اسٹوڈیو کے ایک اعلیٰ اور متوسط کارکن کو "ملاڈ" (جہاں کہ یہ نگارخانہ تھا) سے دور رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ تقریب قریب سب اسٹوڈیو کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ محسن عبداللہ اپنی بیوی شاہدہ کے ساتھ قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کوٹھی میں مقیم تھا۔

محسن لیبارٹری میں بڑی توجہ سے کام کرتا۔ ہمانسو رائے اس سے بہت خوش تھے۔ اسکی تنخواہ اتنی ہی تھی جتنی کہ اشوک کمار کی تھی جب وہ اس لیبارٹری میں ملازم ہوا تھا۔ مگر وہ اب کامیاب ایکٹر بن رہا تھا۔

ان دنوں آنندوری اور ممتاز بھی وہیں تھے۔ مسٹر مکرجی جو اس وقت مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ تھے۔ سب خوش باش آدمی تھے۔

ہر سال ہولی کے موقعے پر بڑا دلکش ہنگامہ برپا ہوتا سب ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے اور بڑی پیاری رنگ رلیاں مچتیں۔

"پونرملن —" کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ تو ہمانسو رائے نے سیتہ پربھا پردھان کو جو خاصی پڑھی لکھی لڑکی تھی اپنے اس فلم کے لئے ہیروئن منتخب کیا۔ ان دنوں خواجہ احمد عباس وہاں پبلسٹی کا کام کرتے تھے۔ محسن اور عباس دونوں اس لڑکی پر عاشق ہو گئے۔ جو سندھ کی رہنے والی تھی۔ اور بمبئی میں نرسنگ کا کورس مکمل کر چکی تھی۔

محسن اور عباس دونوں چاہتے تھے۔ کہ پربھا ان کے جذبات کی نرسنگ کرے مگر وہ بڑی تیز نشتر تھی وہ دونوں کو چرکے لگاتی تھی — یہ ایک لمبی کہانی ہے

جسے میں پھر کسی وقت لکھوں گا۔"

محسن اس کے عشق میں کچھ ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے بے تحاشہ جوا کھیلنا شروع کر دیا اسے جتنی تنخواہ ملتی سب قمار بازی کی نذر ہو جاتی۔

شاہدہ سخت پریشان تھی — اس کو اپنے گھر سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ منگوانا پڑتا تھا۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ جو آئے دن بیمار رہتا۔ اس کے علاج پر کافی روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔

"شاہدہ نے ایک دن بڑے شریفانہ انداز میں اس سے کہا۔ "محسن — تم میرا خیال نہیں کرتے — کم از کم اپنے بچے کا تو کرو۔"

وہ اس پر بہت برسا۔ اس لئے کہ اس کے سر پر جوئے اور سیتہ پربھا پردھان کا عشق سوار تھا۔

میں ان دنوں نانو بھائی ڈیسائی کے ہندوستان سنے ٹون اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔ شانتا رام نے جو پربھات فلم کمپنی میں کئی شاندار فلم تیار کر چکے تھے۔ مجھے دعوت دی کہ تم پونہ آؤ۔ کئی صحافی اور افسانہ نویس وہاں جا رہے تھے۔ یہ خیر سگالی قسم کی دعوت تھی۔

مدعو کئے گئے لوگوں میں ایک صاحب ڈبلیو زیڈ احمد بھی تھے۔ جو غالباً سادھنا بوس کی ٹیم میں کام کرتا تھا مجھے اتنا یاد ہے احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بنگالی کے مکالمے اردو میں ترجمہ کرتا ہے۔

ہم پونہ میں دو روز رہے اس دوران میں مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ

ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ اپنے چہرے پر خول سا چڑھائے رکھتا تھا اس کی سہی اس کی گفتگو ـــــ اس کا ہر انداز مصنوعی سا دکھائی دیتا تھا۔ ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ مشہور یہودی ڈائرکٹر ارنسٹ لیوبش کی طرح ہر وقت منہ میں ایک بڑا لمبا سگار دبائے رکھتا ہے۔

اس کے بعد میری اور اس کی ملاقات "راما شکل" ایکٹر کے مکان پر ہوئی وہ میرا دوست تھا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں ڈبلیو زیڈ احمد کرسی پر بیٹھا راما کی محبوب شراب رم پی رہا تھا۔

اس سے علیک سلیک ہوئی ـــــ بڑی رسمی قسم کی ـــــ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے کھل کر بات کرنے کا عادی نہیں ـــــ گو وہ ایک کچھوا ہے جو اپنی گردن جب چاہے اپنے سخت خول کے اندر چھپا لیتا ہے آپ ڈھونڈتے رہیں مگر نہ ملے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"احمد صاحب کچھ بات تو کیجئے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا ـــــ "آپ راما شکل سے باتیں کر رہے ہیں کیا۔ یہی آپ کے لئے کافی نہیں ہے:"

یہ جواب سن کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سیاست داں سے ہمکلام ہوں ـــــ سیاست سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

احمد سے راما شکل کے فلیٹ پر متعدد مرتبہ ملاقات ہوئی ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ وہ کونے میں کرسی پر بیٹھا رم پیتا رہتا تھا۔ میں اور راما شکل اپنی بکواس میں مشغول رہتے۔

قریب قریب دو سال گزر گئے مجھے کسی نے بتایا کہ ڈبلیو زیڈ احمد کوئی فلم کمپنی قائم کر رہے ہیں ـــــ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نگال کے مکالمے ترجمہ کرنے والا یہ شخص کیسے فلم کمپنی بنائے گا۔"

مگر اس نے بنائی۔ پونہ میں ـــــ اس کا نام شالیمار اسٹوڈیو رکھا گیا اور اشتہار بازی فوراً شروع ہو گئی۔

میں نے یہ اشتہار دیکھے ان میں خاص زور ایک ایکٹریس "نینا" پر دیا جاتا تھا جس کو بار بار پراسرار کہا جاتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کسی ایکٹریس میں اسرار کیا ہو سکتا ہے۔ جب کہ اسے اسکرین پر آنا ہے۔ اس کے تو سارے بھید وہیں کھل جائیں گے۔

مگر دو برس تک برابر یہی پبلسٹی ہوتی رہی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ پراسرار نینا کون ہے ـــــ مگر کسی کو اس نئے چہرے کے متعلق علم نہیں تھا۔ بابو راؤ پٹیل ایڈیٹر فلم انڈیا کے ساتھ مجھے اتفاقاً کام کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ "سالا" تم جانتا نہیں ـــــ کیسا اڈیٹر بنا پھرتا ہے۔ وہ ـــــ تم محسن عبداللہ کو جانتا ہے"

"میں نے کہا۔" ہاں نام سنا ہے۔ کچھ کچھ ان کے متعلق جانتا بھی ہوں"

"نینا۔ اس کی بیوی ہے۔ اب سمجھا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"اس کا نام شاہدہ ہے۔"

میں نے جب بالو راؤ سے مزید استفسار کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ شاہدہ ریز کا دیوی کی بھاوج ہے۔ میں نے اسے بمبئی ٹاکیز کی فلم میں بھابی میں ہیروئن کے رول میں دیکھا تھا ــــ اور اس کی کردار نگاری سے بہت متاثر ہوا تھا۔

اب میرے دماغ میں دو بھابیاں تھیں ایک بمبئی ٹاکیز کی بھابی دوسری شاہدہ عرف نینا رینو کا دیوی کی بھابی۔

مجھے ڈبلیو زیڈ احمد سے مزید ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے سوچا کہ وہ بڑا اندازہ گیر ہے۔ وہ مہمیں طے کرنے والا انسان ہے۔ سوویت روس کے ایکٹروں کی طرح کئی کئی برسوں کی سکیمیں بناتا ہے۔ اور بڑے اطمینان سے ان کے نتائج کا انتظار کرتا ہے۔

میں بڑا اجلد باز ہوں ــــ اس لئے فطری طور پر مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا ــــ میں بڑبولا تھا۔ وہ نہایت کم گو ــــ اس میں تصنع ہی تصنع تھا۔ اور میں اس بناوٹ کا سخت مخالف ــــ وہ باتیں کرتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ــــ کوئی مشین بول رہی ہے۔"

لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ جب بھی بولتا بڑی نپی تلی بات کہتا ــــ چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کئی زبانیں بولتا تھا۔ مرہٹی

گجراتی، اردو انگریزی اور پنجابی ــــ اصل میں وہ پنجابی ہے۔ اس کے خاندان کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ مولانا صلاح الدین احمد (اڈیٹر ادبی دنیا) اس کے بھائی ہیں ــــ ان کے ایک بھائی ریاض احمد بھی ہیں جو کسی اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔

یہ مضمون پڑھنے والے مشکل سے یقین کریں گے کہ مولانا صلاح الدین احمد ڈبلیو زیڈ احمد (وحید) کے بھائی ہیں ــــ لیکن یہ حقیقت ہے ــــ مجھے معلوم نہیں۔ یہ دو بھائی ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا کہ نہیں لیکن ان دونوں میں ایک مماثلت ضرور ہے کہ احمد (ڈبلیو زیڈ) سندھ کے مشہور وزیر اعظم غلام حسین ــــ ہدایت اللہ کی لڑکی سے بیاہے ہوئے تھے مجھے معلوم نہیں کہ ان کا رشتہ وہاں کیسے ہوا ــــ ان تفصیلات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

آج سے ایک ماہ پہلے احمد جب ہال روڈ پر اپنے بال کٹوانے آیا تو میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس حجام کے قریب ہی رہتا ہوں میں اس کو زبردستی اپنے مکان میں لے آیا اور اس سے کہا۔

"میں نینا کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں کیا تم مجھے اس کی اجازت دیتے ہو۔"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ــــ "میں آپ کو ایک دو دن میں بتا دوں گا۔"

کئی روز گزر گئے — اس کے بعد احمد سے میری ملاقات ڈائرکٹر کے دفتر میں ہوئی — میں نے پھر اس سے پوچھا کہ "اب اجازت دینے میں کتنے روز چاہئیں۔"

اس کے پاپ لگے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ پیدا ہوتی۔ نیم گنجا سر ذرا چمکنے لگا۔ اور اس نے کہا۔

"میں آجکل بہت مصروف ہوں — بس ایک ہفتے کی مہلت چاہتا ہوں۔"

چوہدری فضل حق صاحب (ڈائرکٹر کے مالک) اور شباب صاحب (ڈائرکٹر) کے دفتر میں بیٹھے تھے — میں نے کہا — "بہت بہتر ہے۔ ایک ہفتہ گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے؟"

دو ہفتے گزر چکے ہیں — مگر مجھے احمد سے اجازت نہیں ملی۔ میں نے سوچا کہ ایسے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر ایکٹر، ایکٹریس، لکھنے والا اور لکھنے والی عوام کی ملکیت ہوتا ہے — اگر تم ان کے متعلق لکھنا چاہو تو بغیر اجازت لکھ سکتے ہو۔"

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کر دیا۔

شاہ نور اسٹوڈیو قائم ہو گیا — بنا یعنی شاہدہ کا نام وہاں کی لیبارٹری کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب جو کچھ میرے علم میں ہے — آپ سے بیان کرتا ہوں —

شاہدہ کو ایکٹریس بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ بڑی گھریلو قسم کی

عورت تھی اس کو کسی قسم کا سنگار پسند نہیں تھا۔

"اچھا — اب آپ یہ بھی سن لیجئے — احمد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بڑا اندازہ گیر تھا۔ اس نے روسیوں کی طرح ایک پنجسالہ سکیم بنائی اور اس کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیا۔

اس دوران میں اس نے اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ اس مضمون میں اس سے کوئی زیادہ اثر پیدا نہیں ہو سکے گا۔

محسن کہتا ہے کہ جب یہ دوران کے عشق میں مصروف تھا۔ جب مالی مشکلات پیدا ہوئیں تو اس نے اپنی بیوی شاہدہ سے کہا — "تم بڑی بیکار ہو — میری بہنوں کی طرف دیکھو کتنی روشن خیال ہیں۔"

شاہدہ نے غالباً اس سے کہا —

"مجھے معاف کیجئے میں اتنی روشن خیال نہیں ہو سکتی۔"

ان کے درمیان کئی چپقلش ہوئیں محسن چاہتا تھا — کہ وہ فلم لائن میں داخل ہو جائے مگر اس کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

عصمت چغتائی نے (اب عصمت شاہد لطیف) جو ضدی، آرزو اور بزدل جیسے کامیاب فلموں کی کہانی لکھ چکی ہے) میری بیوی سے کہا۔ کہ شاہدہ علی گڑھ میں اس کی ہم جماعت رہ چکی ہے بڑی اوٹ ہے۔ بہت ہی سادہ لوح ہے۔"

میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ اس نے عصمت سے پوچھا۔ "یہ رائے تم نے کیسے قائم کرلی۔"

"میری سہیلی ہے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں"

"تمہاری میرے متعلق کیا رائے ہے۔"

عصمت نے جواب دیا۔ "تم تو بڑی کھری عورت ہو۔"

"اس میں کیا عیب ہے۔"

"کچھ بھی نہیں —— لیکن تم شاہدہ سے بہت زیادہ مختلف ہو"

"کس لحاظ سے۔"

"وہ بے وقوف ہے —— تم بیوقوف نہیں ہو —— تم اپنے خاوند کو سنبھالنا جانتی ہو۔ اس کو اپنے خاوند کو سنبھالنا نہیں آتا۔"

"یہ تم کیسے کہتی ہو۔"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اس کے سارے دکھڑے سے واقف ہوں —— بہت سیدھی سادھی سی لڑکی تھی ہم کالج میں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے —— وہ جھینپ جھینپ جایا کرتی تھی۔"

عصمت نے میری بیوی کو بتایا کہ اسے عشق و محبت کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ کیسے محسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی اس کا خیال تھا کہ محسن کچھ زیادہ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا ہوگا۔ کہ وہ رضامند ہو گئی۔ اس لئے

کہ وہ طبیعت کے لحاظ سے بہت نرم ہے اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔"

محسن نے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا شاہدہ کو مجبور کیا کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے وہ بادل نخواستہ رضامند ہو گئی —— چنانچہ اس کے تاتوں کا دھول پر سٹیملا اسٹوڈیو تعمیر کر دیا گیا۔ اور احمد ڈبلیو زیٹ ایک پروڈیوسر بن گیا۔ اور اس نے شاہدہ کو پراسرار مینا بنا دیا

معلوم نہیں یہ نام احمد نے اس کے لئے تجویز کیا تھا۔ یا اس کے شوہر محسن نے۔

احمد نے فلم بنانے سے پہلے اس پراسرار مینا کی بڑی تشہیر کی ہر پرچے میں یہ نام دیکھنے میں آتا لوگوں کے دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کون سی آفت جان ہے چنانچہ اس فلم کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا۔ اس کا نام ایک رات تھا۔ اس کی تکمیل میں کتنی راتیں اس نے کاٹی ہوں گی بہرحال وہ بن گئی۔

اس کی کہانی مشہور ناول "لٹ" کا چربہ تھا اس میں شاہدہ پراسرار مینا کو گوالن کا رول دیا گیا تھا۔ ایک شخص اس کی عصمت لوٹ لیتا ہے اس کے بعد اس کی باقاعدہ شادی ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی بھولی ہے۔ اپنے خاوند سے اپنی گزشتہ زندگی کے حادثے کو بیان کر دیتی ہے وہ اس کو دھتکار دیتا ہے۔

احمد ڈبلیو زیٹ اپنا بحشادہ سکیم کے تحت شاہدہ سے کچھ اس طرح مل رہا

تھا جس طرح مالو ہوت کسی دوسرے سیفر سے مل رہا ہے۔
شاہدہ کا خاوند محسن اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھا۔ اس کے ناکام عشق کا سلسلہ سینہ پر بجا پردھان سے بدستور جاری تھا۔ شاہدہ سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ میں اس زمانے کی یہ بات کر رہا ہوں جب شالیمار اسٹوڈیوز قائم نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں ۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں یہ مضمون غیر مسلسل لکھ رہا ہوں لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں —— اس لئے کہ خیالات جیسے دماغ میں آتے ہیں میں قلم بند کئے جاتا ہوں۔

احمد جو محسن کے دوست بن گئے تھے —— شاہدہ کو بیگم کہتا۔ اس کو ضرورت سے زیادہ تعظیم کرتا جب وہ آتی تو اٹھ کھڑا ہوتا اور اسے تسلیمات عرض کرتا۔

احمد نے یہ رویہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا اس لئے کہ وہ محسن کی بے پروائی کا تقابل بننا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا۔ وہ بڑا دقیقہ شناس تھا کہ وہ شاہدہ کو ایک، دو برسوں میں نہیں کم از کم پانچ برسوں میں ضرور حاصل کرے گا —— !

اب میں آپ سے عرض کروں کہ فلمی دنیا میں اکثر و بیشتر حضرات عورتوں کے ذریعہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے پیش نظر بھی نا بجا یہی نسخہ تھا۔
احمد نے اس پر چھا جانے کے لئے کافی وقت صرف کیا۔ اس کے خاوند محسن

عبداللہ کو ہر جہت سے خوش کرنے کی کوشش کی مگر وہ طبعاً اوباش تھا۔
شالیمار اسٹوڈیوز میں جب محسن کو لیبارٹری انچارج بنا دیا گیا اور اس کی معقول تنخواہ مقرر کر دی گئی۔ تو اس نے اپنے شغل اور زیادہ زور شور سے جاری رکھے۔

شاہدہ یہ سب کچھ ایک گھریلو عورت کی مانند دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی گلہ شکوہ کرتی مگر اس کے خاوند پر جو تن آسان تھا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کو بھی آخر کی گھٹی گھٹی فضا سے باہر نکل کر شالیمار اسٹوڈیوز میں ایک بہت بڑا میدان مل گیا تھا جس میں وہ اپنے اشغال میں بڑی بے تکلفی سے مصروف رہ سکتا تھا۔

شاہدہ جو ایکٹریس بن گئی تھی اسے اس گوالن کا رول ادا کرنا تھا جس کی عصمت لوٹ لی گئی تھی لیکن اسے اپنے شوہر سے پیار تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فلمی دنیا سے نکل کر گھریلو دنیا میں چلی جائے۔ اسے یہ اسرار کہلانا پسند نہیں تھا۔!

لیکن جب اس کے متعلق اشتہار بازی ہوتے دو برس ہو گئے۔ تو اس کے ننھے سے گھروندے میں جس کو دل کہتے ہیں عجیب عجیب سی تحریکیں پیدا ہونے لگیں جن سے وہ پہلے ناآشنا تھی۔!
اس کے سامنے جو تقابل احمد نے پیش کیا وہ اس کے متعلق سوچنے لگی وہ آداب کا مجسمہ تھی۔ اسی کے خلاف محسن بہت تکلیف وہ قسم کا بے ادب

تھا وہ اس سے بہت برا سلوک کرتا اس کے علاوہ شاہدہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی۔ کہ وہ اسٹوڈیو میں دوسری عورتوں سے عشق لڑاتا پھرتا تھا۔

احمد نے محسن کو جس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ وہ اسے اس کی اسکیم کے اسٹوڈیو کی سنبھال نہ کر سکا۔۔۔۔۔ اس نے محسن کو کبھی ٹوکا نہیں تھا۔۔۔۔ کہ وہ جوا کیوں کھیلتا ہے ریس میں روپیہ کیوں ہارتا ہے۔۔۔۔۔ لڑکیوں سے کیوں دلچسپی لیتا ہے وہ جانتا تھا کہ بری طرح وہ ان خرابیوں میں گرفتار ہو جائے۔ اسلئے کہ وہ خود ایک بہت بڑی خرابی کے درپے تھا۔

احمد کی اسکیم میں جو کچھ تھا۔۔۔۔ وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن بھولی بھالی شاہدہ اسے نہ سمجھ سکی۔ اپنے دل کی عجیب وغریب دھڑکنوں کو بھی نہیں سمجھتی تھی میک اپ کرتی۔۔۔۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتی۔۔۔۔ اور سشدر رہ جاتی اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ گارز وردی کے ناول ہیٹس کی گوالن ہے۔ جس کی عصمت لٹ جانے والی ہے۔

اس نے جب فلم میں اپنا رول ادا کرنا شروع کیا تو اس کا حجاب کسی قدر دور ہو گیا۔۔۔۔ محسن اسی قدر اس سے دور ہوتا گیا۔۔۔۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا کہ اس کے دور دھاگے کچھ ٹانکے تڑخ رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ تینوں ٹانکے ٹوٹیں۔۔۔۔ لیکن احمد نے ان کی تریڑوں کو یقین دلایا کہ وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔

تریڑیں آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگیں اسلئے کہ احمد ایسے معاملوں میں بڑا ماہر کاریگر ہے اسلئے ان میں اپنی سیاست کا سمنٹ بھرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ محسن کے بھی چونا لگا رہا تھا۔

احمد بڑا اچھا معمار ہے اس نے اپنا کام بہت آہستہ مگر بڑی صفائی سے کیا آخر وہ محسن کی اینٹ کو اپنی عمارت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس دوران میں شاہدہ کو یقین دلایا تھا کہ اس کا شوہر ایک اوباش اور ناکارہ آدمی ہے اس نے اس کو محض اسلئے اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا کہ اسکی عادات سدھر جائیں گی مگر وہ اس قابل ثابت نہیں ہوا شاہدہ یہ سب باتیں سنتی رہی اور اس کو یقین سا آنے لگا۔ کہ شاید یہ درست ہیں۔

لیبارٹری کا کام بہت سست رفتار تھا۔ خود احمد بھی چیونٹی کی چال چلنے والا تھا لیکن ایک دن اس نے محسن سے بڑی نرمی سے کہا۔

" دیکھئے آپ سے کام نہیں ہوتا۔۔۔۔ شاید اسلئے کہ آپ اسے اپنے رتبے کے مطابق نہیں سمجھتے۔۔۔ میں لیبارٹری کسی اور کے حوالے کر دیتا ہوں جو تنخواہ آپ کی مقرر کی گئی تھی برابر آپ کو ملتی رہے گی۔"

محسن پہلے تو سخت طیش میں آگیا لیکن اس کی یہ آگ فوراً احمد نے بجھا دی اسلئے کہ وہ بڑا اچھا فائر بریگیڈ ہے چنانچہ شاہدہ کا خاوند ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور اسے پنشن ملنے لگی۔

" میں محسن کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بیک وقت ذکی الحس اور نکمہ

ہے اس وقت شائد اس پر بے حسی طاری تھی ——— کہ اس نے احمد کا یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

اس کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جس سے وہ غفلت برت رہا ہے اور جس کو اس نے مجبور کیا ہے کہ وہ اسکی بہنوں کی طرح آزاد ہو اس کی مانگ میں کوئی اور ہی نیا سیندور ڈال رہا ہے۔

وہ قطعاً غافل تھا۔ اس کو دراصل اپنی بیوی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو بمبئی اور پونا کے گھوڑوں، تاش کے پتوں اور پونے کے کاٹیجوں سے شغف تھا۔

فلم بن رہا تھا۔ شاہدہ گوالن یعنی پراسرار نینا کے نام سے اس میں کام کرنے میں دن رات مصروف تھی۔ اور احمد ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس کو ایسی ڈائرکشن دے رہا تھا۔ جو اسکے مقصد کو پورا کرے۔

محسن عبداللہ کافی وجیہہ مرد ہے۔ لم تڑنگ مضبوط جسم تعلیم یافتہ مگر ضرورت سے زیادہ روشن خیال ——— اس نے شالیمار اسٹوڈیوز سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنی بیوی کی مفارقت کے متعلق جس سے اس نے عشق کے تحت شادی کی تھی کچھ زیادہ خیال نہ تھا۔ اسے شاہدہ پر کامل اعتبار تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اب آزاد تھا اور اس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔

ڈبلیو زیڈ احمد بڑا وضعدار آدمی ہے۔ وہ اپنے عملے کے دوسرے

آدمیوں کو تنخواہ وقت پر ضرور ادا کر دیتا۔ یہ اس کے کیرکٹر کا ایک خاص پہلو ہے وہ چھچھورا یا کمینہ نہیں اس میں ایک اعلیٰ خاندان کے فرد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن سوئے اتفاق سے وہ چونکہ فلمی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت سراسر سیاسی تھی اسلئے اسے اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا۔

اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے لاکھوں روپے کمائے ان کو اس نے کسی عیاشی میں تباہ نہیں کیا۔ دراصل وہ بڑا اسپیل انگار اور سست رفتار ہے اس کے علاوہ خوشامد پسند بھی وہ بڑے چھوٹے پیمانے پر ایک مغل بادشاہ ہے جو اپنے ارد گرد شاعروں، بھانڈوں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کا جمگھٹا لگائے رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں شائد اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں اس کے ہاں شاعر نظامی، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر کرشن چندر ایم اے اور بھرت ویاس ملازم تھے اس کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور میرا بھانجہ مسعود پرویز بھی تھے۔

یہ سب احمد کے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھتے کہانی کے مکالموں پر بڑی گرما گرمی بحثیں ہوتیں ساری رات گزر جاتی اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا اس لئے کہ درباری ماحول ہوتا تھا کوئی بات شروع ہوئی۔ تو جوش ملیح آبادی نے مرقع محل کے مطابق اشعار سنانے شروع کر دیئے داد ہو رہی ہے مسعود

پرویز جس کا دماغ اس زمانے میں حاضر تھا نے فوراً اسی زمین میں چند شعر گھڑ ڈالے ساغر نظامی کو تاؤ آیا تو اس نے ایک لمبی نظم ترنم میں پڑھ دی۔

کرشن چندر اُن دنوں بیٹھا رہتا ـــــ افسانہ نگار تھا اسکو شعروں سے بھلا کیا واسطہ ـــــ؟

ان نشستوں میں کام بہت کم ہوتا ـــــ باتیں بہت زیادہ ہوتیں بھرت ویاس کو یہ احساس کمتری تھا۔ کہ وہ اردو زبان نہیں جانتا اسلئے وہ اپنی سنسکرت آمیز ہندی بگھارنا شروع کر دیتا۔

کبھی کبھی احمد جب کوئی موزوں فقرہ بولتے تو جوش ملیح آبادی عش عش کرتے اور کہتے ـــــ

"احمد صاحب ـــــ آپ تو شاعر ہیں۔"

بس احمد صاحب اسی وقت اپنا کام بھول جاتے اور شعر کی فکر کرنے لگتے محفل برخواست کر دی جاتی اور وہ ساری رات غزل کی تکمیل میں مصروف ہوتے جو میرا خیال ہے کہ آج تک ایک بھی مکمل نہیں ہوئی۔

یہ سب لوگ احمد کے خوشامدی تھے جوش ملیح آبادی کو ہر شام رم کا ادّھا مل جاتا تھا شروع شروع میں شالیمار اسٹوڈیو میں چند مہینوں تک باقاعدہ تنخواہیں ملتی رہیں اس کے بعد بے قاعدگی شروع ہو گئی عملے کے آدمی صرف ایڈوانس لیتے تھے۔

وہاں کی فضا عجیب و غریب تھی ـــــ ڈائرکٹر ایک تھا۔ مگر اسکے اسسٹنٹ

دس بارہ کے قریب تھے۔ اسسٹنٹ اسسٹنٹ اور ان اسسٹنٹ معلوم نہیں یہ لوگ گزارہ کیسے کرتے تھے۔ اسلئے کہ تنخواہ تو وقت پر ملتی ہی نہیں تھی۔

بہر حال یہ احمد کا معجزہ ہے کہ اس نے شالیمار اسٹوڈیو کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رکھا ہوا تھا وہ بڑا کائیاں انسان ہے اس کو مشکل سے مشکل وقت بھی پریشان نہیں کر سکتا بڑے اطمینان سے چاندی کی ڈبیہ میں سے پان نکالے گا۔ بٹوے میں سے چھالیہ اور تمباکو نکال کر کلے میں دبائے گا۔ اور مسکرانا شروع کر دے گا۔

اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی پرکار سیاستدان میں ہو سکتی ہیں اس نے اسی سیاست کی بدولت شالیمار اسٹوڈیو بنایا اور آہستہ آہستہ اپنا راستہ صاف کر کے شاہدہ پر قبضہ کر لیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شاہدہ میں ایسی کیا کشش دکھائی دیتی کہ اس نے اسکے سپاٹ جسم پر ایک نگار خانہ تعمیر کر دیا وہ ایسی عورت ہی نہیں تھی جو ایکٹریس بننے کے قابل ہو مگر شاہدہ احمد کو اس وقت کوئی اور لڑکی میسر نہیں تھی۔ یا آسانی سے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی کہ اس نے اپنے دوست محسن کی بیوی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بعد میں وہ اسکے گھریلو پن سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اسکی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے ہو سکتا ہے احمد کو شاہدہ سے کبھی محبت نہ ہوئی ہو محض اپنے مفاد کی خاطر جب وہ اس پر لگا تار اپنی شرافت کا بوجھ ڈالتا رہا

تو وہ اپنے خاوند محسن عبداللہ کو بھول گئی۔ مگر یہ نظریہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ طلاق ہونے تک وہ اپنے شوہر سے جدا ہونا پسند نہ کرتی تھی میں اسکے متعلق آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔

لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ شاہدہ احمد کے ساتھ کیوں رہتی رہتی ٹھہریئے ——— میں بھول گیا ——— شروع شروع میں وہ دونوں الگ الگ رہتے تھے۔ مگر بعد میں ایک ہی کوٹھی میں رہنے لگے۔

جانے کونسا سن تھا۔ میں ملتان میں ملازم تھا۔ ایس مکرجی وہاں کے پروڈکشن کنٹرولر تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا۔ کہ تم کوئی کہانی کیوں نہیں لکھتے ہو میں نے چنانچہ پانچ دن میں چار کہانیاں لکھیں ——— مکرجی نے مجھ سے کہا کہ مجھے سناؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اور چاروں کہانیاں اپنے بھائی مسعود پرویز کو بھیجدیں جو شالیمار اسٹوڈیو میں ملازم تھا۔

پہلی کہانی کنٹرولستان تھی۔ مجھے چوتھے روز مسعود کا تار ملا کہ تمہاری یہ کہانی بہت پسند کی گئی ہے بہتر ہے کہ تم پونہ چلے جاؤ تاکہ احمد صاحب سے جملہ معاملات طے ہو جائیں ———

میں پونہ گیا ——— اب یہ ایک لمبی حکایت ہے کہ میں وہاں کس طرح پہنچا میں نے شالیمار اسٹوڈیو کیا کچھ دیکھا صرف ایک دلچسپ بات بتلائے دیتا ہوں کہ سب سے پہلے میں اس اسٹوڈیو کی مرتری (پیشاب خانے) میں گیا چونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں سے متعلق نقاد کے اکثر و بیشتر حالات معلوم ہو جایا کرتے ہیں۔

میں جب اندر داخل ہوا تو سامنے دیوار پر اردو زبان میں جملہ لکھا تھا۔ اور تو سب ٹھیک ہے پر یہاں بیگار (تنخواہ انہیں ملتی۔ میں بڑا بددل ہوا میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن مسعود نے مجبور کیا کہ احمد سے مل لوں۔"

شام کو اس سے ملاقات ہوئی وہ دفتر میں بیٹھا بڑا سگار سلگائے اپنی کرسی پر بیٹھا تھا ایک طرف شاہدہ تھی دوسری طرف جوش ملیح آبادی جوش سے علیک سلیک ہوئی ان کے پاس اک کھلارم کا ادھا تھا جو غالباً احمد نے احتراماً منگوا کر دیا تھا۔ احمد سے میں نے پنجابی میں گفتگو شروع کی لیکن ذرا مجھے احساس ہوا کہ پاس جوش اور شاہدہ بیٹھے ہیں جو یہ زبان نہیں سمجھتے اس لئے میں نے اردو میں بات چیت شروع کر دی۔

میں نے جب اسے پربھات فلم کمپنی میں دیکھا تھا تو بہت توانا و تازہ نوجوان تھا ——— پر اب اس میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ لو چلنے کے باعث جھلس سا گیا ہے۔

اس نے اپنے مخصوص رسمی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا تھا اور شاہدہ عرف پراسرار نینا سے بھی متعارف کیا تھا۔

اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں کوئی اسرار پوشیدہ ہو۔ معمولی خد و خال کی عورت تھی میں نے جب اسے پہلی مرتبہ احمد کے دفتر میں دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آبی رنگوں کی ایک ایسی تصویر ہے جو بارش میں چھت ٹپکنے کے باعث اپنے رنگ کھو چکی ہے۔

اس میں ایکسٹراؤں کی سی ایکٹ لیسٹ نہیں تھی۔ خارش ایک کرسی پر بیٹھی تھی اسکو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ میں کون ہوں ۔۔۔۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ میں اس کے شوہر محسن عبداللہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

تھوڑی دیر جوش ملیح آبادی سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اپنا نام کا کوٹا یعنی رم کا ادھا ہاتھ میں تھامے بیٹھے تھے اور احمد مشہور جرمن فلم ڈائرکٹر کی نقل اتار رہا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک لمبا سگار ہونٹوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

میں وہاں اپنی ایک کہانی بیچنے کے سلسلے میں گیا تھا اسکے متعلق اس دن کوئی بات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ میں نے پراسرار نینا کو دیکھ لیا۔

فلمستان میں محسن عبداللہ کو میں نے ہی ملازم رکھوایا تھا۔ اسکی حالت بہت پتلی تھی ایک دن میں نے پروڈکشن کنٹرولر مسٹر مکرجی سے کہا کہ وہ بمبئی ٹاکیز کے زمانے میں اس کا دوست رہ چکا ہے اس کو شرم آنی چاہیئے کہ وہ غریب کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

مکرجی نے دوسرے روز ہی اسے بلایا آپس میں دوستانہ گفتگو ہوئی اس کے بعد مکرجی نے دوستانہ طور پر اس سے کہا۔ کہ وہ فلمستان میں کیوں نہیں آجاتا۔ تو وہ راضی ہو گیا۔ اور اس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

محسن عبداللہ بڑا کام چور ہے اس کو کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے میرا خیال ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا اس کے لئے کمائے اور وہ کھائے۔

ان دنوں "آٹھ دن" بن رہا تھا جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ اس

کا سفرنامہ میں جب لکھنے لگا۔ تو محسن نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ مجھے کئی مشورے دیئے۔ جو فلمی نقطۂ نظر سے بالکل غلط تھے۔ میں نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

اس دوران میں وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کو شاہدہ کی محبت اب بھی ستاتی ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے (جو عورت بن چکی تھی) جس کا نام ویرا تھا اور جسے ہم نے "آٹھ دن" کی ہیروئن منتخب کیا تھا اپنا ٹانکہ ملا رہا ہے۔

شروع شروع میں وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتا تھا ۔۔۔۔ برقی ٹرین میں تین درجے ہوتے ہیں۔

تھرڈ۔ سیکنڈ اور فرسٹ۔

فلمستان شہر سے کافی دور تھا ۔۔۔۔ غالباً انیس میل ۔۔۔۔ یہ مسافت طے کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگتا تھا۔ لیکن جب رائے بہادر چونی لعل نے فلم آٹھ دن کے لئے ویرا کے ساتھ کنٹریکٹ کیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں آنا جانا شروع کر دیا۔

میرا خیال ہے کہ اب اس سلسلہ خیال کو یہیں بند کر دینا چاہیئے۔

میں احمد کے دفتر میں بیٹھا ایک ابوالہول کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پراسرار نینا بیٹھی تھی۔ لیکن میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی پرانی مصریت نہیں تھی۔

یوں تو پراسرار نینا میرے لئے بالکل اجنبی اور نئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اس کو اس کی پیدائش سے جانتا ہوں جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں وہ بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے یا دکھائی دیتی ہے میرے دل و دماغ میں بے شمار خیالات تھے۔ اس لئے کہ میں محسن عبداللہ کا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنی زندگی کے واقعات کچھ اس انداز میں بتلائے تھے کہ میں ایک سادہ لوح ہونے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ اس کی بیوی شاہدہ کو اس سے بتدریج چھینا گیا ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک خاوند سے اس کی موجودگی میں بتدریج یا بابتدریج کیسے چھینا جا سکتا ہے۔

اصل میں وہ اس سے غافل تھا۔ ...... اور سینما پر بھاپردھان کے عشق میں مبتلا تھا اس کے علاوہ اس کو جوئے بازی کا بھی شوق تھا۔ تاش کھیلنا اور اکثر ہارنا۔

اس کو اپنی بیوی سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا۔ کہ وہ اس کی بہنوں کی طرح سے آزاد نہیں ہے۔ وہ مزید فلمی ماحول سے قطعاً آشنا ہونا نہیں چاہتی تھی دل ہی دل میں کڑھتی تھی کہ اس کا خاوند جو فلم لیبارٹری میں کام کرتا ہے کیوں اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ فلم ایکٹرس بن جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں ــــ کہ شاہدہ ایک اونچے روشن خیال اور بے باک خاندان کی فرد تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں حجاب، بدرجۂ اتم موجود

تھا۔

اس نے شروع شروع میں اپنے خاوند محسن عبداللہ سے یہ شکایت کی کہ وہ کیوں ایک ایکٹریس سے عشق لڑا رہا ہے۔ کیوں جوا کھیلتا ہے اور بیکار روپیہ ضائع کرتا ہے

مگر محسن نے اپنی بیوی کی کوئی بات نہ سنی۔

ڈبلیو زیڈ احمد ان کے گھر بدستور آتا رہا وہ اس کا اتنا احترام کرتا تھا۔ کہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس احترام کے قابل نہیں۔ اس کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ احمد جس کے ساتھ ڈبلیو زیڈ چپکا ہوا ہے کوئی ایسا مرد ہے جو محسن کے مقابلے میں اس پر زیادہ حسنِ احسان کر سکتا ہے۔

محسن میں پردھان کے چکر میں پڑا تھا۔

میں آپ کو یہاں بتا دوں کہ مس پردھان بڑی قبضہ گیر قسم کی عورت ہے اور محسن جو اپنی بیوی کو قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتی تھی۔ ؟

ظاہر ہے کہ ان کے رومان کا انجام ناکام رہا۔

معاف کیجئے گا کہ میں بہک گیا اور باتوں ہی باتوں میں خدا معلوم کہاں پہنچ گیا۔

ویسے آپ سے یہ عرض کرنا تھا کہ احمد کے دفتر میں جب نینا سے میری ملاقات ہوئی تو میں حسبِ معمول پئے ہوئے تھا اور جب میں پیئے

ہوئے ہوتا ہوں تو مجھے تکلف برتنا نہیں آتا۔

چنانچہ میں نے پُراسرار نینا سے کہا۔ کہ آپ کا اسرار تو میں نہیں جانتی — اس لئے کہ وہ ڈبلیو زیڈ احمد کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔

یہ سن کر ڈبلیو زیڈ احمد نے میری طرف دیکھا اور یہ معذرت کر کے کہ اسے کسی سے باہر ملنا ہے۔

چلا گیا —— اور ساتھ جوش ملیح آبادی کو بھی لے گیا

ایسے معاملوں میں ڈبلیو زیڈ احمد کا کوئی جواب نہیں —— وہ ہر رمز اور ہر کنایہ پہچانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پنجسالہ اسکیم کے ماتحت نینا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کو اس نے پراسرار بنا دیا — اصل میں اسرار سارا احمد کا ہے۔ جس نے اسے ایک لوٹن کبوتری بنا کر رکھ دیا ہے۔ صرف اسی کے گھر میں انڈے دیتی ہے

ایک انڈا اس نے محسن کے گھر میں بھی دیا تھا جس کا چوزہ صحت مند نہیں تھا۔ یہ ڈبلیو زیڈ احمد کی کاریگری ہے۔ یا آپ اسے کوئی اور نام دے دیجئے کہ وہ ابتک اسے پالتا پوستا ہے۔

میں نے احمد کے چلے جانے کے بعد نینا سے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا۔

میں نے اسے کہا۔ کہ وہ تمہاری یاد میں اکثر آنسو بہاتا رہتا ہے۔"

یہ سن کر اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی

منٹو صاحب —— آپ اس شخص کو نہیں جانتے اس کا ہر آنسو انگریزی کے محاورے کے مطابق مگرمچھ کا آنسو ہوتا ہے۔۔ وہ آنسو نہیں بہاتا بلکہ آنسو اس کو بہاتے ہیں۔

یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا —— بہرحال شاہدہ عرف پراسرار نینا کی بے اسرار سنجیدگی یہ ظاہر کر دیتی تھی۔ کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں دروغ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ان دنوں میرا بائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کرشن بھگوان کے لئے احمد نے حسب دستور اپنی پنجسالہ اسکیم کے ماتحت بھارت بھوشن کو کرشن بھگوان کا پارٹ ادا کرنے کے لئے زیر معاہدہ کر رکھا تھا۔

چنانچہ بھوشن کو ہر روز باقاعدگی کے ساتھ مکھن اور دوسری طاقتور غذائیں کھلائی جاتی تھیں۔ کہ وہ بہت دبلا تھا۔ اور اس قابل نہیں تھا کہ وہ مکھن چور بن سکے۔

بھارت بھوشن کو مکھن کھلانے کے ساتھ ساتھ احمد شاہدہ کے اسرار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ جو اس کے پروگرام کے عین مطابق تھا۔

ظاہر ہے کہ جب خاوند کسی دوسری عورت کے ساتھ ہو گا تو اس کی

یہی رسمت جو روشن خیال اور آزاد ہو۔ یقیناً کسی نہ کسی سے جنسی رابطہ پیدا کرے گی۔ چنانچہ یہی ہوا اور مشہور کمیونسٹ لیڈر سبط حسن سے اس کا معاشقہ ہو گیا۔

مجھے اس رومان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں تھیں اسلئے میں نے سبط حسن سے یہاں لاہور میں کئی ملاقاتیں کیں لیکن اس سے کھل کر بات نہ کر سکا۔ ہر روز یہی سوچتا کہ دوسرے روز جب وہ آئے گا یا جب میں اس سے ملوں گا تو احمد کی بیوی کے بارے میں دریافت کروں گا۔ کہ یہ سلسلہ کیسے ہوا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ صفیہ جو کافی پڑھی لکھی عورت ہے امریکہ کی علمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے گئی۔ اور سبط حسن بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

میں یہ مضمون ضرور مکمل کرتا جو کسی لحاظ سے بھی تشنہ نہ رہتا لیکن اچانک حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور سبط حسن گرفتار کر لئے گئے۔ اسلئے کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔

گرفتاری سے پہلے ایک شام جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے پائپ میں یہاں کا گرد بھرا تمباکو پی رہے تھے۔ میری یہ خواہش تھی کہ ان سے کرید کرید کر احمد کی سابقہ بیوی صفیہ کے متعلق پوچھوں کہ اس سے ان کا معاشقہ کیسے ہوا۔۔۔۔ یہ اب وہ کہاں ہے۔۔۔۔ یہ سبط حسن تین برس جیل میں رہنے کے بعد آئے تھے۔۔۔۔ احمد اور سبط حسن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ احمد سیاسی

آدمی ہے۔ سبط حسن اس کے برعکس جذباتی۔۔۔۔ اسے بیچ کالا اسکیں پسند نہیں وہ چاہتا ہے کہ جو کام ہو فٹافٹ ہو یوں دیکھنے میں وہ بڑے تیکھے ہیں لیکن اندرونی طور پر بہت ملائم۔

گرفتاری سے چند روز پہلے وہ میرے یہاں تشریف لائے۔۔۔۔ معیت یہ تھی کہ میرے اور کئی ملاقاتی موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں سبط حسن سے میں کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں ان سے میں نے پوچھا۔

"کہیے اب آپ کب جیل جائیں گے"

سبط حسن نے پائپ کا ایک کش لگایا اور مسکرا کر کہا۔ "چند دنوں میں"

اور واقعی وہ پندرہ بیس روز کے بعد جیل میں داخل کر دیئے گئے اور میرا یہ مضمون نامکمل رہ گیا۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن کیا کروں۔۔۔۔ یہ موضوع ہی ایسا ہے جو ہزار پہلو ہے۔

شاہدہ (نینا) کے شوہر محسن عبداللہ ایک بڑی خطرناک لڑکی ہمینہ پر بھارپٹھان سے عشق فرما رہے تھے ان کی بیوی پر احمد صاحب بڑے سلیقے سے اپنی اسکیم کے ماتحت آہستہ آہستہ ڈورے ڈال رہے تھے۔

ادھر ادھر اور بھی بہت کچھ ہو رہا تھا۔۔۔۔ کوئی مسز نورانی تھیں ان کے ساتھ ایک پنجابی لونڈا عشق لڑا رہا تھا یہ مسٹر نورانی احمد کی رشتہ دار تھیں یا مسز نورانی کی۔۔۔۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ میں نے کئی مرتبہ اس کو ان کے گھر میں

جو فورجیٹ اسٹریٹ پر تھا دیکھا۔

وہ پنجابی لونڈا بھی عجیب و غریب تھا معلوم نہیں کرکٹ اسے عارضہ تھا لیکن ظاہر وہ یہی کرتا کہ اس کو دل کو دورے پڑتے ہیں۔

مسٹر نورانی خاموش کرسی پر سگار سلگائے بیٹھے تھے اور ان کی بیگم پنجابی نوجوان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہتی۔ کبھی کبھی بوس و کنار بھی ہو جاتا مگر مسٹر نورانی کے سگار کی راکھ ویسی کی ویسی اس پر ثابت و سالم رہتی۔

عجیب سلسلہ تھا ——— محسن عبداللہ سینہ پر کھایا پر دھان کے عشق کے چکر میں تھے ان کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جما رہے تھے ادھر احمد کی بیوی صفیہ سعید حسن سے رومان لڑا رہی تھی۔ اور ان کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو جب دماغ چکرا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میاں بیٹھے ہیں اور انکی بیوی کسی غیر مرد سے چرما چاٹی کر رہی ہے۔ ایک شوہر اپنی سہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹریس کے پیچھے مارا مارا پھر رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں عورتیں اور مرد ہمیشہ ایسے ہی سلسلے کرتے آئے ہیں۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے بے اعتنائی برتے کسی اور عورت کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ہزاروں

میں صرف چند عورتیں ایسی نکلیں گی جو کسی اور مرد سے ناطہ نہ جوڑیں،

پونا میں احمد اور نینا (شاہدہ) اکٹھے رہتے تھے ——— ایک بنگلہ تھا بہت اچھا لیکن احمد اس میں کبھی کبھار آتا۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کرتا اور چلا جاتا ——— آہستہ آہستہ اس نے وہاں مستقل طور پر قیام کر لیا۔ اب وہ دونوں، ایک ساتھ صبح کو ناشتہ کرتے دوپہر کو لنچ کھاتے اور رات کو ڈنر پر بھی ایک ساتھ ہوتے۔

اسٹوڈیو میں تو خیر ان کا ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ اس دوران میں احمد نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ شاہدہ کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔

شاہدہ کے خاوند محسن عبداللہ کو تو احمد اپنی حکمت عملی کے ذریعہ سے اپنے اسٹوڈیو سے یوں نکال چکا تھا۔ جیسے مکھن سے بال۔ وہ بمبئی میں سڑکوں پر پیدل چلتا تھا ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پونہ سے بمبئی کار میں آتا تھا۔ پر اب اسے کوئی لفٹ دینے والا نہیں تھا میں ایک روز ٹیکسی پر نیپئن سی روڈ سے گزر رہا تھا کہ محسن مجھے نظر آیا میں نے ٹیکسی رکوائی اور اس کی خیریت پوچھی۔

"سنایئے محسن صاحب۔ آپ کہاں ہوتے ہیں آج کل ———"

اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ ——— عجیب قسم کی مسکراہٹ

پیدا ہوئی ـــــ "آج کل میرا کام سڑکیں ناپنا ہے"

میں نے ازراہ مذاق اس سے پوچھا۔ "میکلوڈ روڈ کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے؟"

اس نے بھی میرے ہی انداز میں جواب دیا ـــــ "آپ جتنی لمبی ـــــ مجھ ایسی چوڑی ـــــ!"

میں نے اس سے کہا کہ آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ، جہاں تمہیں جانا ہے وہاں چھوڑ دوں گا مگر اس نے میری یہ دعوت قبول نہ کی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بہت مضطرب تھا۔

اور اس اضطراب کی وجوہ کئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی بیوی کو قریب قریب کھو چکا تھا۔ سینہ پر بھابی پردھان اس سے سخت بے اعتنائی برت رہی تھی اس کے علاوہ وہ جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی ہار چکا تھا اور کوئی ملازمت بھی نہیں تھی۔ جس کا آسرا ہوتا۔

میں نے اس سے پوچھا ـــــ "ساوتری پردھان کا کیا حال ہے؟"

اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا۔ "ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اس سے خواجہ احمد عباس عشق لڑا رہا ہے" اس کا کیا حشر ہو گا۔

محسن نے مسکرا کر کہا۔ "دو تین مہینوں کے اندر اندر گنجا ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا ـــــ "کیوں ـــــ؟"

اس نے جواب دیا "اس عورت کو آپ نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں سیفٹی ریزر ہے اور وہ بھی ایسا کہ اس کے مونڈے ہوئے بال پھر کبھی نہیں اُگتے۔"

میرے جسم پر بیشمار بال ہیں۔ میں نے سوچا۔ اگر یہ سیفٹی ریزر میرے ہاتھ میں آجائے تو میں کتنی جلدی اس لعنت سے نجات پا جاؤں مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے کوشش نہ کی۔ ورنہ میرا بھی حشر وہی ہوتا جو محسن عبداللہ اور خواجہ احمد عباس کا ہوا ـــــ خواجہ گنجا ہو گیا اور محسن کے بال بھی جھڑنے لگے۔

مدت کے بعد جب میں فلمستان میں بحیثیت افسانہ نگار اور منظر نویس ملازم ہوا تو محسن سے میری ملاقات ہوئی اس کی حالت بہت دردناک تھی مجھے معلوم تھا کہ وہ مسٹر ایس مکرجی کا دوست ہے اس لئے کہ وہ کچھ روز بمبئی ٹاکیز میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے اور وہاں کا ماحول بہت دوستانہ ہے۔

احمد بمبئی ٹاکیز سے کبھی وابستہ نہیں رہا تھا وہ صرف سادھنا بوس کے ساتھ ایک دو برس رہا معلوم نہیں اس کے ساتھ اس کے کیا تعلقات تھے بہرحال وہاں سے نکل کر اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور اس کا کرتا دھرتا بن گیا۔ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ احمد بہت سیانا اور ذہین آدمی ہے اس نے بڑے بڑے مارواڑیوں کو عنچ دیا: کچھ ایسے طور پر کہ ان

کو خبر تک نہ ہوئی۔ اور ایک دن اس نے اعلان کر دیا کہ پُراسرار نینا اسکی باقاعدہ منکوحہ بیوی بن چکی ہے۔ اسکی اپنی سہرے جلوے کی بیاہی صفیہ غالباً اس وقت امریکہ میں تھی۔ جہاں سبط حسن پہنچ چکا تھا۔

میں ان دنوں پونا گیا کہ مجھے اپنی کہانی کے سلسلے میں احمد سے بات چیت کرنا تھی۔ مسعود پرویز وہاں پر دھان بنا ہوا تھا وہ مجھے احمد کے پاس لے گیا ــــ اس سے ملاقات ہوئی ــــ ادھر اُدھر کی چند رسمی باتیں اور کہانی کے متعلق باتیں کیں اور میں واپس بمبئی چلا گیا۔

بمبئی میں جب محسن عبداللہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کو فلمستان اسٹوڈیو میں بتایا کہ میں نے تمہاری شاہدہ کو وہاں دیکھا تھا اور اس سے باتیں بھی ہوئی تھیں۔

اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ادھر اُدھر کی ــــ"

"میرے متعلق بھی کوئی بات ہوئی۔"

"ہاں ہوئی تھی ــــ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ تمہاری جدائی کے غم میں مر رہے ــــ" محسن کے چوڑے چکلے چہرے پر حزن کے آثار پیدا ہوئے

"شاہدہ نے کیا کہا یہ سن کر۔"

"بس خاموش رہی ــــ"

"خاموش رہی"

"تو اور کیا کرتی ــــ" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بیوی کا قصہ دہرایا کہ مجھے یہ فلم لائن قطعاً پسند نہیں۔ لیکن محسن نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔ اب میں اس میں داخل ہوئی ہوں تو وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں اس لئے کہ شاید وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ ایکٹرسوں کے پیچھے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں محسن نے اپنا گلا صاف کیا۔ بلغم دور پھینک کر کہا۔ "میں کس ایکٹرس کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہوں ــــ مس پردھان تھی ــــ اس سے تو میں نے قطع تعلق کر لیا ہے ــــ اب کون ہے۔"

میں نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ــــ "مس ویرا ہے"

یہ وہی مس ویرا ہے جس نے فلمستان کے ایک فلم میں جسے نیتن بوس نے ڈائرکٹ کیا تھا غالباً ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ لیکن بڑے بھونڈے انداز میں "اس لڑکی سے" جو عورت بن کر خدا معلوم کیا بننے کا ارادہ کر رہی تھی محسن صاحب عشق فرما رہے تھے۔

غالباً وہ بہنز پربھا پردھان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے کہ وہ ان سے ملتفت ہوتی ہی نہیں اس کے اور کئی چاہنے والے موجود تھے جن میں سے ایک کشور ساہو تھا جو ایک بہت بڑا فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہے ان کی شادی ہو گئی اور طلاق بھی بڑے دلچسپ انداز میں۔ میرا خیال ہے میں اس

مضمون میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ مس پردھان بڑی قبضہ گیر قسم کی عورت ہے ساہو نے کسی اور عورت سے رابطہ پیدا کرنا چاہا ہوگا کہ اس نے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا ساہو بھی غالباً اسکی قبضہ گیری سے تنگ آگیا تھا مگر طلاق کا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا اس لئے کہ شادی سول میرج قانون کے تحت ہوئی تھی۔ اور صرف اسی صورت ٹوٹ سکتی تھی کہ فریقین میں سے کوئی یہ ثابت کرے کہ وہ زنا کاری کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی میں باقاعدہ کانفرنس ہوئی اور یہ طے پایا کہ میاں عدالت میں اپنی بیوی کے اس الزام کو تسلیم کرے کہ وہ ازدواجی فرائض فرائض ادا کرنے کا اہل نہیں دوسرے لفظوں میں نامرد ہے۔ ساہو مان گیا جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ وہ عورت کے قابل نہیں۔

خیر — یوں تو اس قصے کا ذکر بظاہر غیر ضروری معلوم ہوگا مگر اس داستان کے بیان کرنے میں مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے اس کا ذکر دیا۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ویرا پارسی ہے وہ بہت مایوسیوں کے بعد اپنے وطن سے ہجرت کر کے کسی شخص کے ساتھ بمبئی چلی آئی جو فلم انڈسٹری سے وابستہ تھا اس نے ویرا کو موتی لال ایکٹر کے حوالے کر دیا مگر موتی لال جیسا خشتہ پیشہ اسے کب تک اپنے ساتھ چپکائے رکھتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کا جی اکتا گیا۔

"ویرا شکل و صورت کے اعتبار سے مرد کہلائی جا سکتی ہے نہ عورت اس کا سینہ بالکل سپاٹ ہے۔ سطح مرتفع دکن معلوم ہوتا ہے۔"

میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں فلمستان میں ہم لوگ "آٹھ دن" کے عنوان سے ایک فلم بنا رہے تھے ہمیں کمپنی کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ مس ویرا کو ہیروئن کا رول دیا جائے۔ اشوک کمار کو سخت اعتراض تھا۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ مس ویرا میں اداکاری کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایک صرف اس کے سینے کا سپاٹ پن دور کر دینا چاہیے۔

چنانچہ میں نے اسٹوڈیو کے میک اپ مین اور لیڈی ہیر ڈریسر سے مشورہ لیا ان دونوں نے مجھ سے کہا — "تردد کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم یہ مشکل حل کر دیں گے۔"

مشکل حل ہو گئی — وہ چیز جو مس ویرا کے سینے پر ناپید تھی کپڑے اور روئی کے ذریعے سے تیار کر کے اس کو پہنا دی گئی۔ مس ویرا جب شوٹنگ سے فارغ ہو کر محسن عبداللہ کے ساتھ اپنے گھر جاتی تو اس مصنوعی چیز کو اپنے جسم سے علیحدہ کر کے کھونٹی پر لٹکا دیتی تھی۔

مس ویرا کے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا — وہ گھر سے برقی ٹرین کے ذریعے سے فرسٹ کلاس میں اس ننھے منے کتے کے ساتھ فلمستان آتی۔ جب شوٹنگ ہوتی تو وہ مس ویرا کے کمرے میں بندھا رہتا۔

محسن عبداللہ سیکنڈ کلاس میں اسٹوڈیو آتا تھا لیکن ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے باہر نکلا اس کے ہاتھ میں زنجیر تھی۔ جس کی ہک کے ساتھ مس دیرا کے کتے کا خوبصورت پٹا منسلک تھا۔

سگ لیلےٰ والا قصہ تھا — بہرحال یہ سلسلہ چلتا رہا ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی دونوں اکٹھا کھاتے۔ اکٹھے اسٹوڈیو آتے اور شوٹنگ ختم ہونے پر اکٹھے واپس جاتے۔ ڈبلیو زیڈ احمد کو اپنے اسٹاف کو تنخواہ دینے کی اتنی فکر نہیں رہتی مگر وہ اس کو بہلانا خوب جانتا ہے اگر آج پونہ کی کسی پہاڑی پر پکنک ہو رہی ہے۔ تو دوسرے روز مشاعرہ منعقد کیا گیا ہے۔

ایک رات مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں مسٹر وڈوانی بھی تھے معلوم نہیں کس ترنگ میں آ کر اس نے ان سے کہا کہ "وہ مان گئی ہے"

وڈوانی نے اس سے پوچھا۔ "کون مان گئی ہے"

احمد نے جواب دیا شاہدہ۔ "وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی ہے"

"مجھے معلوم نہیں کہ ان کی شادی کہاں ہوئی۔ لیکن صرف اتنا جانتا ہوں کوئی اسٹیٹ تھی جہاں ان کا نکاح ہوا۔ اسٹوڈیو کے اسٹاف کے کئی کارکن مدعو کئے گئے تھے ان میں سے ایک کا یہ بیان ہے کہ شاہدہ شادی کے بعد بھی ناخوش تھی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ بہت کم گو شریف اور گھریلو قسم کی عورت

ہے اس کو ہجوم سے باجے گاجے اور شور و شر سے سخت نفرت ہے۔ جب دولہا اور دولہن کو سجی سجائی موٹر میں بیٹھنا تھا تو شاہدہ کے قدم نہیں اٹھتے تھے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں شالیمار اسٹوڈیوز کی ایکٹریسوں نے اس سے کہا۔ "آپ اتنی پیچھے رہ گئی ہیں۔ احمد صاحب کے ساتھ ساتھ چلیں۔"

مگر اس پر عجیب قسم کا حجاب طاری تھا آخر احمد ہی کو اس کے پاس آنا پڑا اس نے بڑی جرأت سے کام لے کر اپنی دولہن کا ہاتھ پکڑا اور اسے موٹر میں بٹھایا۔

ڈبلیو زیڈ احمد کی پہلی بیوی صفیہ اور شاہدہ بڑی پکی سہیلیاں تھیں شاہدہ جو بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح ہے غالباً یہ محسوس کرتی تھی کہ اس نے اپنی سہیلی کے ساتھ دغا کی ہے۔

لیکن اس کی سہیلی صفیہ اس زمانے میں مشہور کمیونسٹ سبط حسن کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی مجھے افسوس ہے کہ اس معاشقے کی تفصیل مجھے معلوم نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب صفیہ تعلیمی کانفرنس یا کسی اور سلسلے میں امریکہ گئیں تو سبط حسن وہیں موجود تھے یا وہاں پہنچ گئے اور ان کی شادی ہو گئی۔

سبط حسن برٹ بیبے (پنجابی زبان میں) آدمی ہیں بہت پرخلوص جب پاکستان میں تین برس کی قید کاٹ کر آئے تو مجھ سے ملے میں ان دنوں یہ مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ پہلی ملاقات میں ان سے کچھ پوچھنا میں نے

"معلوم نہیں صفیہ کہاں ہے۔ شاہدہ تو خیر ڈبلیو زیڈ احمد کے پاس ہے اور گھریلو زندگی بسر کر رہی ہے"

شاہدہ جسے پراسرار نینا کہا جاتا ہے پرلے درجے کی کنجوس ہے جیسا کہ عام گھریلو عورتیں ہوتی ہیں، وہ اپنی ذات کے لئے خرچ کرتی ہے لیکن دوسروں کے معاملے میں ایک پائی زیادہ خرچ نہیں کرے گی۔

جب وہ شالیمار اسٹوڈیو میں تھی تو اس کے کمھی چوس رویے سے وہاں کے سب ملازم تنگ آئے ہوئے تھے۔ کوڑی کوڑی کا حساب لیتی۔

ایک دن ڈریس مین کے بل کی جو ادا ہو چکا تھا اس نے پڑتال کی اور اس کو معلوم ہوا کہ حساب کے مطابق کچھ سو روپے اور ساڑھے پانچ آنے چاہئیں؛ تھے مگر وہ چھ آنے وصول کر چکا تھا چنانچہ بیگم صاحب نے فوراً ڈریس مین کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ "یہ کیا گڑبڑ ہے —— تم نے ساڑھے پانچ آنے کی بجائے چھ آنے کمپنی سے کیوں وصول کئے ہیں۔"

ڈریس مین کو جب بل دکھایا گیا تو واقعی ساڑھے پانچ آنے بنتے تھے اس سے حساب میں غلطی ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے دو پیسے دے کر اپنی خلاصی کرائی۔ یوں تو اسے اسٹوڈیو کا ہر ملازم بیگم صاحب کہتا تھا۔ لیکن ان کے دل میں اس کی کوئی قدر نہیں تھی اس لئے کہ وہ عام ایکٹریسوں کی مانند فضول خرچ چرب زبان اور یاوہ گو نہیں تھی وہ ایک مہذب عورت تھی

معیوب سمجھا۔

دوسری ملاقات کچھ ایسے منحوس وقت پر ہوئی جب میرے گھر میں دوستوں کا جمگھٹا لگا تھا میں ان سے ان کے معاشقے کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا۔

تیسری ملاقات، ایک ادبی میٹنگ میں ہوئی میں نے ان سے کہا۔ "معاف کیجئے گا —— مجھے آپ سے ڈبلیو زیڈ احمد کی سابقہ بیوی صفیہ کے متعلق کچھ پوچھنا ہے اس پراسرار نینا پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں آپ کوئی وقت مقرر کر دیں بڑی نوازش ہوگی۔"

انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پائپ کا ایک کش لگا کر اپنی مخصوص دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں آپ کو ساری داستان کہانی سنا دوں گا —— ابھی آپ کے ساتھ چلتا مگر مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

یہ موقع یوں ہاتھ سے گیا —— اس کے بعد وہ ایک دن تشریف لائے اور صرف اتنا کہہ کے چل دیئے میں معذرت چاہتا ہوں کہ اتنے دن حاضر نہ ہو سکا میرا خیال ہے کہ اب آپ کو تین چار برس تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں ——؟"

وہ مسکرائے۔ "میں عنقریب گرفتار کیا جانے والا ہوں۔"

دو تین روز کے بعد میں نے سنا کہ وہ سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے ہیں

یہ جذبات ہیں کہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی شہادت کے لئے کئی ثبوت موجود ہیں کہ شاہدہ کو مسلم لاتن سے کوئی دلچسپی تھی۔ اور نہ اب ہے وہ اپنے گھر میں خوش ہے میں نے حال ہی میں اس سے ملاقات کرنا چاہی تاکہ میں اس مضمون کو بطریق احسن مکمل کر سکوں۔ لیکن احمد نے کہا کہ وہ بہت مصروف ہیں۔

لیکن مجھے امید ہے کہ میں شاہدہ سے ایک روز ضرور ملوں گا۔ یہ مضمون تو خیر قسط وار پڑھتی ہی رہی ہوگی لیکن اس کی آنکھوں میں جو اداسی تیرتی رہتی ہے اور اس کی چال میں جو غمزدہ دھیماپن ہے اور اس کی گفتگو میں جو عجیب قسم کی افسردگی ہے اس کے متعلق مجھے معلومات حاصل کرنا ہیں۔

شاہدہ کے متعلق عام خیال یہ ہے۔ کہ وہ بد دماغ ہے۔ کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ غلط ہے میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ وہ خاموشی پسند اور بحیثیت گھریلو عورت، اسے اپنے گھر کے سوا اور کسی سے دلچسپی نہیں وہ الگ تھلگ رہنا پسند کرتی ہے۔ وہ اموریش بیوی ہے۔ اگر آپ اس سے پر خلوص انداز میں بات کریں تو وہ اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دے گی اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے اور وہ اپنے پہلے شوہر محسن عبداللہ کو یاد کرے گی لیکن اپنے دوسرے خاوند ڈبلیو زیڈ احمد کو اس کی تمام سیاسیات (جن

کو وہ غالباً اپنے بھولپن کی وجہ سے نہیں سمجھتی) کے باوجود اپنے دل کے قریب رکھے گی۔

محسن عبداللہ کے نطفے سے شاہدہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو سدا بیمار رہتا ہے۔ ڈبلیو زیڈ احمد کے نطفے سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے لڑکا شاید ایبٹ آباد میں ہے اور وہاں کسی اسکول میں پڑھتا ہے اس معاملے میں احمد کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ کہ وہ اس سے بڑی ہی شفقت سے پیش آتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ محض دکھاوے کی ہو بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ محسن عبداللہ اس معذور بچے کی پرورش بطریق احسن کبھی نہ کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ ایک لاابالی قسم کا انسان ہے۔

احمد اور محسن میں زمین و آسمان کا فرق ہے احمد اپنی خداداد ذہانت اور مہم جو طبیعت کے بل بوتے پر کماتا ہے اس کے برعکس محسن ایسے سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے جو اسے کام کرنے کی لعنت سے نجات دلا سکیں۔

شاہدہ مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہوگی لیکن جہاں تک میں اس کے سابق شوہر کو جانتا ہوں وہ اول درجے کا کام چور ہے۔ یوں وہ خود کو بہت مصروف ظاہر کرے گا۔ مگر اس مصنوعی مصروفیت کا نتیجہ ہمیشہ صفر ہی نکلے گا۔

احمد کی زندگی مسلسل تگ و دو کی زندگی ہے وہ ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اس لئے کہ وہ خود ایک بہت بڑی آفت ہے جو فلم انڈسٹری پر نازل ہوئی ہے۔

میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ روسیوں کی طرح بڑا سکیم باز ہے اسے اگر سگار پینا ہوگا تو اس کی سکیم کئی روز پہلے تیار ہو چکی ہوگی۔ اس کا ہر قدم خاص اسکیم کے تحت اٹھتا ہے۔

شاہدہ سیدھی سادی عورت ہے اسے اسکیموں سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ ایک گھر ہو جس میں وہ اپنی زندگی گزار دے۔

وہ کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتی اس لئے کہ اس کی فطرت میں ایذا رسانی کا مادہ ہی موجود نہیں میں جب بھی اس سے ملا تو میں نے چاہا کہ اس سے کہوں۔

"تم عیسائی مذہب اختیار کر کے راہبہ بن جاؤ"

لیکن وہ عیسائی مذہب اختیار کئے بغیر اور کسی راہب خانے میں رہے بغیر "نن" معلوم ہوتی ہے۔ یوں وہ پارٹیوں میں جاتی ہے لیکن محض تکلفاً کے طور پر۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ اپنے وجود سے اکتائی ہوئی ہے

یا اس فضا سے جس میں وہ سانس لے رہی ہے اسے اپنے گرد و پیش کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ——

شاید اپنے آپ سے بھی۔

وہ برف کا ایک تودہ ہے جو قدرت کی ستم ظریفی سے پہاڑوں پر (گر کر) سے پھسل کر کھلے میدانوں میں چلا آیا اور آہستہ آہستہ پگھل رہا ہو۔

ہو سکتا ہے شاہدہ کو میری اس بات سے اتفاق نہ ہو لیکن اگر وہ غور کرے تو اس کو اس تشبیہ کی صحت ماننا پڑے گی۔ قدرت نے اس کو مفرح شربت کی بوتل کی شکل میں دنیا میں بھیجا تھا۔ لیکن لوگوں نے اسے اُبال کر جلیبی کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

اس میں شاہدہ کا کوئی قصور نہیں —— قصور صرف ان لوگوں کا ہے۔ جنہوں نے اس کو غلط طور پر استعمال کیا محسن عبداللہ نے اس کو اپنی روشن خیال اور آزاد بہنوں کا حوالہ دے کر بار بار لعن طعن کی کہ وہ کبھی ان ہی کے مانند بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔

جب وہ کسی قدر مائل ہوئی تو ڈبلیو زیڈ احمد نے اسے اپنی پہلی فلم کی ہیروئن بنا دیا —— اور وہ جسے فلمی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی شاہدہ سے پراسرار نینا بن گئی۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب وہ اشتہاروں میں پراسرار نینا کا نام جلی

حروف میں پڑھتی ہوگی تو اس کا ردعمل کیا ہوتا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنی اداس اداس آنکھوں سے یہ اشتہار پڑھ کے یہ محسوس کرتی ہو کہ یہ پراسرار دنیا شاہدہ نہیں کوئی اور ہوگی جسے وہ قطعاً نہیں جانتی۔

یا اسے یہ خیال آتا ہو کہ میں کل کیا تھی۔ آج کیا بن گئی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دھوکے دکھاتے ہوئے سبز باغوں میں اس نے خود کو بے بس محسوس نہ کیا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ انجام کار ان سبز باغوں میں کھو گئی۔ شاید اس لئے کہ اس نے ایسے باغ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یا ان کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس کے اداس پن کی وجہ سے یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ اس کا رڈ کا ایک لحاظ سے یتیم ہوگیا تھا — میں نے پونہ میں ایک مرتبہ اس سے پوچھا یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب وہ اور احمد ایک ہی کوٹھی میں اکٹھے مگر علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے تھے۔

میں نے اس سے کہا۔ "آپ اتنی اداس، اداس کیوں رہتی ہیں۔؟"

وہ اور زیادہ اداس ہوگئی۔

"نہیں تو۔"

"نہیں تو کا مطلب، جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ یہ ہے کہ اس اداسی کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔"

"کوئی وجہ نہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے جب بھی آپ کو دیکھا حزن و ملال میں لپٹی ہوئی دیکھا — میری نظر میں کوئی خامی ہے یا آپ خودفریبی سے کام لے رہی ہیں۔"

شاہدہ کے دل میں جیسے تیر سا لگا۔ "آپ اس گفتگو کو بند کیجئے۔"

میں نے پوچھا کیوں؟

اس نے جواب دیا — "آپ کو میرے پرائیویٹ معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

"میں نے کہا۔ آپ پرائیویٹ پراپرٹی نہیں ہیں پبلک پراپرٹی ہیں آپ کے متعلق ہر شخص اپنی دانست کے مطابق کچھ نہ کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے"

شاہدہ ناراض ہوگئی مگر اس کی اس ناراضی نے اس کے چہرے کے خدوخال اور زیادہ معصوم کردیئے۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسی موم بتی ہے۔ جو تیز ہوا میں جلنے کی کوشش کر رہی ہے اس کی لو لڑکھڑا رہی ہے کچھ ایسے انداز میں جیسے اسے یقین نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ رہ سکے گی۔ میں نے اس سے کہا۔

کیا آپ کبھی اپنے دل کا صحیح حال کسی کو نہیں بتائیں گی"

اس کے ماتھے پر چند شکنیں نمودار ہوئیں "آپ کون ہوتے ہیں میرے

دل کا صحیح حال جاننے والے۔ میں جیسی بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں ٹھیک ہے۔ آپ میرے متعلق اتنے متفکر کیوں ہیں۔"

"اسلئے کہ آپ سے بحیثیت ایک افسانہ نگار مجھے دلچسپی ہے"

"آپ کو یا کسی اور افسانہ نگار کو مجھ سے دلچسپی نہیں لینی چاہیئے۔ میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔"

میں نے آپ کو کھلونا کبھی نہیں سمجھا۔ آپ گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت ہیں لیکن ایسی عورت جس سے کسی نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ آپکو گلہ کس سے ہے اپنے خالق سے یا ان مردوں سے جنہوں نے آپ کو کھلونا سمجھا۔

پراسرار مینا کے پھیکے ہونٹوں پر اور بھی زیادہ پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے کوئی بدرنگ کھلونا ٹوٹ گیا ہے، آپ مجھ سے باتیں زیادہ مت کیجئے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے"

میں نے اس کو چڑانے کے لئے پوچھا۔ اس درد کا باعث کیا ہے"

"مجھے کیا معلوم۔ ڈاکٹر جانتے ہوں گے"

یوں تو پونا اور بمبئی میں بے شمار ڈاکٹر تھے۔ جن میں کئی ماہر بھی تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ وہ شاہدہ کی بیماری ــــ اصل بیماری کی تشخیص نہیں کر سکتے۔

وہ اب بھی بیمار ہے۔ اسکی یہ بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے ڈبلیو زیڈ

احمد سے وہ اپنی قسمت وابستہ کر چکی ہے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک خلا میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کو شاید اس بات کا بھی یقین نہیں کہ وہ زندہ ہے مردہ ـــ وہ نہ ہونے والی فضا میں معلق ہے۔ جہاں پھول کانٹے بن جاتے ہیں اور کانٹے پھول۔ جہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور جھلسا دینے والی تیزاب کی بھی۔

شاہدہ دراصل بہار بھی ہے۔ اور خزاں بھی ـــ خزاں کے دوران میں اس پر بادل نظر آ سکتے ہیں اور بہار کے موسم میں پت جھڑ ـــ اس کے کردار کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے وقت کوئی دقیقہ شناس وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس الجھن میں گرفتار ہے۔

موسمیات کے ماہرین عام طور پر پیشن گوئیاں کرتے رہتے ہیں کہ آج مطلع صاف رہے گا۔ ابر آلود۔ گھن گرج ہوگی۔ یا بارش۔ مگر شاہدہ کے متعلق کوئی ایسی پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ ابر آلود ہے وہ برستی بھی ہوگی۔ گرجتی بھی ہوگی اس کا مطلع صاف بھی رہتا ہوگا لیکن اس پر ڈبلیو زیڈ احمد کی شخصیت کلی طور پر چھائی ہوئی ہے۔"

احمد اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی شاہدہ سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے جیسا کہ اس نے پہلی ملاقات پر اس سے کیا تھا۔ وہ اب بھی اس کی عزت کرتا ہے خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں خلوص کتنی رتی ہے بہر حال دونوں

میاں بیوی مصنوعی یا غیر مصنوعی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ڈبلیو زیڈ احمد نے اب خدا معلوم کیا کیا بکھیڑا اسکیم بنائی ہے اس نے گورنمنٹ سے فلم کو اپریٹو بنانے کی منظوری حاصل کی۔

کو اپریٹو بنک سے لاکھوں روپے لئے اور اپنا پہلا فلم "روحی" بنایا اس فلم کے کارکن اس کے متعدد تقرر دوست تھے۔

چاپلوس قسم کے۔

اب احمد بہت سی قانونی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ اگر فلمساز نہ ہوتا بہت بڑا قانون دان ہوتا۔

آج سے دو ڈھائی مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ ہال روڈ پر— رحمان ہیر ڈریسر کے پاس آیا۔ میں نے اس سے شاہدہ اور اس کے عشق کے متعلق گفتگو کرنا چاہی مگر وہ گول کر گیا۔

ڈبلیو زیڈ احمد گول کرنے کا ماہر ہے اس کی ہنسی گو کہ مصنوعی ہوتی ہے۔ لیکن آپ کبھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ کہ وہ اس ہنسی میں آپ کے سوال کا جواب چھپا رہا ہے۔

بشرطیکہ زندگی میں مزید معلومات حاصل کر کے شاہدہ عرف پراسرار نینا کے متعلق کچھ اور بھی لکھوں گا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں

اس غریب میں کوئی اسرار نہیں — اگر عورت کو آپ پراسرار کہہ سکتے ہیں۔ تو یہ آپ کی نادانی ہے۔ وہ عورت ہی نہیں — ٹھیٹ عورت ہے۔

اس سے مل کر ہر سکتا ہے آپ — میرا مطلب ہے وہ لوگ جو بھڑکیلے پن کو پسند کرتے ہیں نا امید ہوں لیکن سنجیدہ آدمی اسے یقیناً بہت احترام کی نظروں سے دیکھیں گے۔

برقعے

ظہیر جب تھرڈ ایئر میں داخل ہوا تو ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسے عشق ہو گیا ہے۔ اور عشق بھی بہت اشد قسم کا جس میں اکثر انسان اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

صبح کالج سے خوش خوش واپس آیا کہ تھرڈ ایئر میں یہ اس کا پہلا دن تھا جوں ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہونے لگا اس نے ایک برقعہ پوش لڑکی دیکھی جو تانگے میں سے اتر رہی تھی۔ اس نے تانگے میں سے اترتی ہوئی ہزار ہا لڑکیاں دیکھی تھیں۔ مگر وہ لڑکی جس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں سیدھی اس کے دل میں اتر گئی۔

لڑکی نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور ظہیر کے ساتھ والے مکان میں چلی گئی۔ ظہیر نے سوچنا شروع کر دیا کہ اتنی دیر وہ اس کی موجودگی سے غافل کیسے رہا۔

اصل میں ظہیر آوارہ منش نوجوان نہیں تھا اس کو صرف اپنی ذات

سے دلچسپی تھی۔ صبح اٹھے ـــــ کالج گئے لیکچر سنے۔ گھر واپس آئے کھانا کھایا ـــــ تھوڑی دیر آرام کیا اور آموختہ میں مصروف ہو گئے۔

یوں تو کالج میں کئی لڑکیاں تھیں اس کی ہم جماعت مگر ظہیر نے کبھی ان سے بات چیت نہیں کی تھی یہ نہیں کہ وہ بڑا رکھ رکھاؤ کا انسان تھا اصل میں وہ ہر وقت اپنی پڑھائی میں مشغول رہتا تھا مگر اس روز جب اس نے اس لڑکی کو تانگے پر سے اترتے دیکھا تو وہ پولیٹیکل سائنس کا تازہ سبق بالکل بھول گیا خواجہ حافظ کے تمام نئے اشعار کے معانی اس کے ذہن سے پھسل گئے اور وہ صرف ان ہاتھوں کے متعلق سوچنے لگا۔ جن میں کتابیں تھیں ـــــ پتلی پتلی سفید انگلیاں ایک انگلی میں انگوٹھی دوسرا ہاتھ جس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا وہ بھی ویسا ہی خوبصورت تھا۔

ظہیر نے اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کی مگر نقاب اتنی موٹی تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے ساتھ والے مکان میں داخل ہو گئی۔ اور ظہیر دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ اتنا کم فاصلہ ہونے کے باوجود وہ کیوں اس کی موجودگی سے غافل رہا اندر جا کر اس نے اپنی ماں سے پہلا سوال یہ کیا۔ ہمارے پڑوس میں کون رہتے ہیں۔

اسکی ماں کیلئے یہ سوال تعجب خیز تھا۔ "کیوں؟"

"میں نے ایسے ہی پوچھا ہے۔"

اسکی ماں نے کہا۔ "مہاجر ہیں ہماری طرح۔"

ظہیر نے پوچھا۔ "کون ہیں کیا کرتے ہیں؟"

ماں نے جواب دیا۔ "باپ بیچاروں کا مر چکا ہے۔ ماں تھی وہ عمر کے ہاتھوں مجبور ہے اب تین بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ بھائی سب سے بڑا ہے۔ وہی باپ سمجھو۔ وہی ماں ـــــ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے اپنی شادی بھی اسلئے نہیں کی کہ اتنا بوجھ اسکے کاندھوں پر ہے۔"

ظہیر کو تین بہنوں کے اس بوجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو اس اکلوتے بھائی کے کاندھوں پر تھا۔ وہ صرف اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو ہاتھ میں کتابیں لئے ساتھ والے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ان تین بہنوں میں سے ایک تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ پنکھے کے نیچے لیٹ گیا۔ اسکی عادت تھی کہ وہ گرمیوں میں کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک ضرور سویا کرتا تھا۔ مگر اس روز اسے نیند نہ آئی۔ وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔

کچھ دن گزر گئے۔ مگر ان کی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ کالج سے آکر اس نے سینکڑوں مرتبہ کوٹھے پر گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر اسکی آمد کا انتظار کیا۔

مگر وہ نہ آئی۔ ظہیر مایوس ہو گیا۔ وہ بہت جلد مایوس ہو جانے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب بیکار ہے۔ مگر عشق کہتا تھا کہ یہ بیکاری ہی سب سے بڑی چیز ہے عشق میں سب سے پہلے عاشق کو اسی چیز سے واسطہ پڑتا ہے۔

چنانچہ ظہیر نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ گھبرائے گا نہیں اپنے عشق میں ثابت قدم رہے گا۔

بہت دنوں کے بعد جب وہ سائیکل پر کالج سے واپس آ رہا تھا اس نے اپنے آگے ایک تانگہ دیکھا جس میں ایک برقعہ پوش لڑکی بیٹھی تھی اس کا قیاس بالکل درست نکلا کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی۔ تانگہ رکا۔ ظہیر سائیکل پر سے اتر پڑا۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں دوسرے ہاتھ سے اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور چل پڑی مگر تانگے والا پکارا۔ "اے بی بی جی۔ یہ کیا دیا تم نے۔"

اس کے لہجے میں بدتمیزی تھی۔ لڑکی رکی۔ پلٹ کر اس نے تانگے والے کو اپنے برقعے کی نقاب میں سے دیکھا ـــــ "کیوں ـــــ کیا بات ہے؟"

تانگے والا نیچے اتر آیا اور ہتھیلی پر اٹھنی دکھا کر کہنے لگا۔ "یہ آٹھ آنے نہیں چلیں گے۔"

لڑکی نے مہین لرزاں آواز میں کہا۔ "میں ہمیشہ آٹھ آنے ہی دیا کرتی ہوں۔"

تانگے والا بڑا واہیات قسم کا آدمی تھا۔ بولا۔ وہ آپ سے رعایت کرتے ہوں گے۔۔۔ مگر

یہ سن کر ظہیر کو طیش آگیا سائیکل چھوڑ کر آگے بڑھا آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک مکا تانگے والے کی ٹھوڑی کے نیچے جما دیا وہ ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک اور اس کی داہنی کنپٹی پر اس زور کا مارا کہ وہ بلبلا اٹھا

اس کے بعد ظہیر اس لڑکی سے جو ظاہر ہے کہ گھبرا گئی تھی مخاطب ہوا آپ تشریف لے جائیے میں اس حرامزادے سے نپٹ لوں گا۔

لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ شاید شکریے کے الفاظ تھے۔ جو اس کی زبان کی نوک پر آکر واپس چلے گئے۔ وہ چلی گئی۔ دس قدم ہی تو تھے مگر ظہیر کو پورے بیس منٹ اس تانگے والے سے نمٹنے میں لگے وہ بڑا ہی ہٹ دھرم قسم کا تانگے والا تھا۔

ظہیر بہت خوش تھا۔ کہ اس نے اپنی محبوبہ کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اس نے تانگے والے کو خوب پیٹا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا۔ کہ برقع پوش لڑکی اپنے گھر کی کھڑکی کے نیچے سے اس کو دیکھ رہی ہے یہ دیکھ کر ظہیر نے دو گھونسے اور اس کوچوان کی ٹھوڑی کے نیچے جما دیئے تھے۔

اس کے بعد ظہیر سر سے پیر تک اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

اس نے اپنی والدہ سے مزید استفسار کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام یاسمین ہے تین بہنیں ہیں۔ باپ مر چکا ہے ماں زندہ ہے معمولی سی جائیداد ہے جس کے کرائے پر ان سب کا گزارہ ہو رہا ہے۔

ظہیر کو اب اپنی معشوقہ کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے یاسمین کے نام کئی خط کالج میں بیٹھ کر لکھے مگر پھاڑ ڈالے لیکن اس نے ایک روز طویل خط لکھا۔ اور یہ تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور اس تک پہنچا دے گا۔

بہت دنوں کے بعد جبکہ ظہیر سائیکل پر کالج سے واپس آ رہا تھا اس نے یاسمین کو تانگے میں دیکھا وہ اتر کر جا رہی تھی۔ لپک کر وہ آگے بڑھا جیب سے خط نکالا اور بہت اور جرات سے کام لے کر اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھا دیئے

یہ آپ کے کچھ کاغذ تانگے میں رہ گئے تھے۔

یاسمین نے وہ کاغذ لے لیے۔ نقاب کا کپڑا سرکایا

”شکریہ۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اس لیے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے خط کا کیا حشر ہونے والا ہے اور وہ بھی اس حشر کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ایک اور تانگہ اس کی سائیکل کے پاس رکا۔ اس میں سے ایک برقعہ پوش لڑکی اتری۔ اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ یہ ہاتھ جس سے کرایہ ادا کیا گیا بالکل ویسا ہی تھا جیسا

اس لڑکی کا تھا جبکہ پہلی مرتبہ ظہیر نے دیکھا تھا۔

کرایہ ادا کرنے کے بعد یہ لڑکی اس مکان میں چلی گئی۔ جہاں یاسمین گئی تھی ـــ ظہیر سوچتا رہ گیا لیکن اس کو معلوم تھا کہ تین بہنیں ہیں ہو سکتا تھا کہ یہ لڑکی یاسمین کی چھوٹی بہن ہو۔

خوش ہو کر ظہیر نے یہ سمجھا تھا کہ آدھا میدان مار لیا ہے لیکن جب دوسرے روز اسے کالج جاتے وقت ایک چھوٹے سے لڑکے نے کاغذ کا ایک پرزہ دیا تو اسے یقین ہو گیا کہ پورا میدان مار لیا گیا ہے لکھا تھا۔

"آپ کا محبت نامہ ملا۔ جن جذبات کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کے متعلق میں آپ سے کیا کہوں ـــ میں ـــ میں ـــ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے اپنی لونڈی سمجھیے۔"

یہ رقعہ پڑھ کر ظہیر کی باچھیں کھل گئیں کالج میں کوئی پیریڈ اٹینڈ نہ کیا بس سارا وقت باغ میں گھومتا اور اس رقعے کو پڑھتا رہا۔

دو دن گزر گئے۔ مگر یاسمین سے ظہیر کی مڈبھیڑ نہ ہوئی اسکو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ اسلئے کہ اسنے ایک لمبا چوڑا محبت بھرا خط لکھ رکھا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچائے۔

تیسرے روز آخر کار وہ ظہیر کو تانگے میں نظر آگئی۔ جب وہ کرایہ ادا کر رہی تھی سائیکل ایک طرف گرا کر وہ آگے بڑھا اور یاسمین کا ہاتھ پکڑ لیا

"حضور یہ آپکے چند کاغذات تانگے میں رہ گئے ہیں۔"

یاسمین نے ایک غصے سے بھرے ہوئے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز لہجے میں کہا۔

"بدتمیز کہیں کے ـــ شرم نہیں آتی تمہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی ـــ اور ظہیر کے محبت بھرے خط کے کاغذ سڑک پر پھڑپھڑانے لگے وہ سخت حیرت زدہ تھا کہ وہ لڑکی جس نے یہ لکھا تھا۔ کہ مجھے اپنی لونڈی سمجھیے۔ اتنی رعونت سے کیوں پیش آئی ہے شاید یہ بھی انداز دلربا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ مگر ظہیر کے دل و دماغ پر یاسمین کے یہ الفاظ ہر وقت گونجتے رہتے تھے۔ بدتمیز کہیں کے۔ شرم نہیں آتی تمہیں ـــ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس رقعے کے الفاظ یاد آتے جس میں یہ لکھا تھا ـــ "مجھے اپنی لونڈی سمجھیے"۔

ظہیر نے اس دوران میں کئی خط لکھے اور پھاڑ ڈالے وہ چاہتا تھا کہ مناسب و موزوں الفاظ میں یاسمین سے کہے کہ اس نے بدتمیز کہہ کر اس کی محبت کی توہین کی ہے مگر اسے ایسے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ خط لکھتا تھا مگر جب اسے پڑھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ درست ہے۔

ایک دن ایک لڑکا آیا اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے کر بھاگ گیا

ہوا ظہیر نے کاپیاں ایک طرف رکھ کر اس نے لفافہ کھولا۔ ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔ جس میں یہ چند سطریں مرقوم تھیں:

"آپ اتنی جلدی مجھے بھول گئے محبت کے اتنے بڑے دعوے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی —— خیر آپ بھول جائیں تو بھول جائیں آپ کی یہ کنیز آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔"

ظہیر چکرا گیا۔ اس نے یہ رقعہ بار بار پڑھا سامنے دیکھا تو یاسمین تانگے میں سوار ہو رہی تھی وہ بھاگا۔ تانگہ چلنے ہی والا تھا اس نے یاسمین سے کہا۔

"تمہارا رقعہ ملا —— خدا کے لئے تم اپنے کو کنیز اور لونڈی نہ کہا کرو مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

یاسمین نے برقعے کی نقاب اچھلی بڑے غصے سے اس نے کہا۔

"بدتمیز کہیں کے —— تمہیں شرم نہیں آتی میں آج ہی تمہاری ماں سے کہوں گی۔ کہ تم مجھے چھیڑتے ہو۔"

تانگہ چل ہی رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ظہیر رقعہ ہاتھ میں پکڑے سوچتا رہ گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے مگر پھر اسے خیال آیا کہ معشوقوں کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے وہ سر بازار اس قسم کے مظاہرے کو پسند نہیں کرتے خط و کتابت کے ذریعے ہی سے طریقے سے ساری باتیں طے

ہو جایا کرتی ہیں۔

چنانچہ اگلے دوسرے روز ایک طویل خط لکھا اور جب وہ کالج سے واپس آ رہا تھا۔ تانگے میں یاسمین کو دیکھا وہ اتر کر کرایہ ادا کر چکی تھی اور گھر کی جانب جا رہی تھی۔ کہ اس نے اپنی سائیکل اس کے بالکل قریب روکی اور اپنا طویل خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے احتجاج نہ کیا۔ ایک نظر اس نے اپنے برقعے کی نقاب میں سے ظہیر کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔

ظہیر نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی نقاب کے اندر مسکرا رہی ہے اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ چنانچہ دوسرے روز صبح جب وہ سائیکل نکال کر کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا اس نے یاسمین کو دیکھا شاید وہ تانگے والے کا انتظار کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ میں کتابیں پکڑی ہوئی تھیں بایاں ہاتھ جھول رہا تھا۔

میدان خالی تھا۔ یعنی بازار میں آمد و رفت نہ تھی۔ ظہیر نے موقعہ غنیمت جانا جرأت سے کام لے کر اس کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رومانی انداز میں اس سے کہا۔ "تم بھی عجیب لڑکی ہو خطوں میں محبت کا اظہار کرتی ہو بات کریں تو گالیاں دیتی ہو۔"

ظہیر نے بمشکل یہ الفاظ ختم کئے ہوں گے۔ کہ یاسمین نے اپنی سینڈل اتار کر اس کے سر پہ دھڑا دھڑ مارنا شروع کر دی۔ ظہیر بوکھلا گیا۔

یاسمین نے اس کو بے شمار گالیاں دیں مگر وہ بوکھلاہٹ کے باعث سن نہ سکا۔ اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہ اپنے گھر کی طرف پلٹا۔ سائیکل اٹھائی اور قریب تھا کہ اپنی کتابیں وغیرہ اسٹینڈ کے ساتھ جما کر کالج کا رخ کرے کہ تانگہ آیا یاسمین اس میں بیٹھی اور چلی گئی۔ ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا اتنے میں ایک اور برقع پوش لڑکی نمودار ہوئی اسی گھر میں سے جس میں سے یاسمین نکلی تھی اس نے ظہیر کی طرف دیکھا اور اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا مگر ظہیر ڈرا ہوا تھا۔

جب لڑکی نے دیکھا کہ ظہیر نے اس کا اشارہ نہیں سمجھا تو وہ اس کے قریب ہوکے گزری اور رقعہ گرا چلی گئی۔

ظہیر نے کاغذ کا وہ پرزہ اٹھایا اس پر لکھا تھا۔

"تم کب تک مجھے یونہی بیوقوف بناتے رہو گے۔ تمہاری ماں میری ماں سے کیوں نہیں ملتی ——— آج پلازا سینما پر ملو۔ پہلا شو۔ تین بجے۔

پروین"

سعادت حسن منٹو

"منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسان سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور نہیں جا سکتے" اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھوا ہے، چکھا ہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پرواہ نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے ——— وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل و خون وغیرہ کے باوجود، خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں

مکتبۂ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور ۲۵